نہ دِل کو راہ پر لائے

کنیز نبوی

کنیز نقوی

اس نے تو اب تک کی زندگی میں محبت کو ہمیشہ مہربان ہی دیکھا تھا مگر اس نے جب زندگی کی بساط پر محبت کے مہروں نے ہجر، جدائی اور وچھوڑے کی چال چلی، تو اسے پہلی بار پتا چلا کہ محبت ظالم بھی ہو سکتی ہے۔

اس نے دھندلائی نظروں سے دور ہوتی عنیزہ عارف کو دیکھا، جو اسے ناکردہ گناہ کی سزا سنا گئی تھی۔

سیف مصطفیٰ نے آنکھیں موند کر نمی کو اندر دھکیلا اور لب بھینچ کر ہاسٹل سے باہر نکل گیا۔

واپسی کا سفر ہمیشہ تھکا دینے والا ہوتا تھا مگر اس

ناولٹ

سرشاری بھی ہوتی جو اس کے رگ و پے میں دوڑتی ہوتی جو اس کا غرور پامال کر دینے والا تھا مگر جب رفیق کرن واپس ان کے بیچ دراڑ ڈالنے کی تیاری کار سی نہیں ہمیشہ ہوئے ہوتے تھے۔

سیف مصطفیٰ نے ہمیشہ کی طرح گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پہلے مڑ کر دیکھا جہاں ایک ہوا کا قریب سے ہوتا موجود ہوتا۔ مگر آج شاید مسکراہٹ اسی اداسی سے ہوا تھا۔ آنکھوں میں ملن کی آس لیے مسکراتے ہوئے ہونٹ وہ خوب صورت وجود کبھی بھی نہیں تھا اسے تھا ایک پردہ ہوتا ہوا نظر آیا اور ایک دھندلا سا

جانب تو نہیں پردہ ہوا ہے بھی ہل سکتا ہے اور سامنے پیرا سا جو سرخ تھا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کی آنکھوں میں چیخی ہی لب گالوں پر تیرتی گئی۔

❁ ❁ ❁

اور جب اس نے ہمیشہ کی طرح مڑ کر دیکھا تو اس سے عنیزہ عارف کا دل چاہا۔ وہ سامنے آ کر اسے چلا کر رک جانے کو کہے اور ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھ کر خود سے کیا ہوا اقرار دہرا دے۔

"سیف مصطفیٰ! مانا کہ تم اس معاشرے کے مرد ہو مگر میں عورت کی انا و وقار کی وارث تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی کہ عورت کی یہی کمزوری ہے۔ وہ چاہتی نہیں پوچھتی ہے اس کا محبوب عام سا مرد ہو کر بھی اس کے لیے دیوتا کا درجہ رکھتا ہے اور یہی الفرض خیال اس کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ سیف مصطفیٰ کو بلاتی اس کی نظر سائیڈ کی میز پر پڑی اور اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ میز پر پڑے پھول جو مرجھا چکے تھے سائے کے دھوئیں کی طرح "آنسو اس کے رخساروں پر بہے تو بکھرے خطوط کھلی ہوئی ڈائری کے پھڑپھڑاتے ورق سامنے منظر واضح ہونے لگے۔

وہ سیف مصطفیٰ کو بھول گئی۔ اپنی محبت کی تپیا کو بھول گئی۔ بھول گئی یہ بات بھی کہ وہ محبت کی پجارن تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سائیڈ میز جیسی ادھ کھلی آنکھیں بھینچے ہوئے ہونٹ اور ابھرا ہوا جسم سفید چادر میں بھی نمایاں تھا۔

اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئیں۔

"نہیں سیف مصطفیٰ! میں تمہارا انتظار نہیں کر سکتی۔ تم بھی تو اس معاشرے کے مرد ہو تمہارے اندر کا بھیڑیا۔ محبت کے پیچھے آنکھوں میں چمکنے والی بھولی بھالی لڑکیاں کیا جانیں شکاریوں کی نیت کا اندازہ ہی۔ یہ کلی رہی تو ہمیں کیا ہوا۔" اس نے اضطراب سے سر جھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں یاس کا ایک ایک عکس روشن تھا۔

❁ ❁ ❁

وہ دن بڑا خوش گوار تھا جب وہ اماں جان اور بابا جان کی خواہش پر ایم بی بی ایس میں داخلہ لے کے آئی تھی۔ عنیزہ نے واپس گھر پہنچ کر اماں اس خبر سے نہال ہو گئیں کہ اس کی بیٹی کو میڈیکل میں داخلہ مل گیا ہے۔ وہ اسے خوشی سے چومتی اور بات بے بات مسکرائیں اور رئیس عارف نظامی دیکھ کے مسکرا دیے۔ تب عنیزہ عارف دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر باپ کو شرارت سے دیکھتی اس سے پہلے کہ وہ ہمیشہ کی طرح آتی۔

"بابا جان! کمال کر دیتے۔" رئیس عارف قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جیسے شرارت کرتے پکڑے گئے ہوں۔

اور اس نے ہمیشہ کی طرح ہنستے ہوئے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"بابا! آپ اماں کی باتوں پر یوں چپکے چپکے مسکراتے ہیں بہت اچھی لگتی ہیں نا اماں آپ کو؟"

"ظاہر ہے عمر گزاری ہے اس کے ساتھ۔" رئیس عارف نظامی کے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو جاتی۔

"بہت چاہا ہے نا آپ نے اماں کو بابا؟" اس نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"لیڈی ڈاکٹر بن گئی ہے پر چولھا چوکی بھی سیکھنی اے۔ اصل وہی جو کرنی۔" (اتنی پڑھی ہو گئی ہے پر سسرال کے ساتھ چٹنی رہتی ہے۔ اصل گا کے ہی گا۔) عائشہ بیگم بیٹی کی باتوں پر جز بز ہو کر بولیں۔

"بابا دیکھیں! اماں مینوں کیا کہندی پئی اے۔" اس نے منہ بسور کر کہا تو رئیس نے ہنس کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"آپ بی بی جانب داری مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" عائشہ نے بگڑ کر کہا۔

"تمہاری ماں سے اختلاف نہیں کر سکتا۔" بابا نے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی۔

"بابا! اماں آپ کی بچپن کی منگ ہیں اور آپ کے ہی گھر رہتی تھیں دادا نے ہی پرورش کی پھر آپ دونوں کے بیچ تو کوئی ظالم سماج نہیں تھا؟" اس نے چپکے سے باپ کے کان میں کہا تو رئیس عارف ہنس کر دھیرے سے بولے۔

"یہی تو میرا نصیب سے ڈر لگتا تھا۔"

"ہولی ہے کیا کھسر پسر کرندی پئی اے پیو دھی۔" "(اے لڑکی یہ کیا کھسر پسر کر رہی ہو باپ کے کان میں۔) ماں نے کہا تو اس کے بھائی نے بھی چھیڑا۔

"بل ہوں کیا کہندی پئی اے ناں۔"

"بیٹی فیروز خان! میڈی دھی کو تو کچھ نہ کہہ۔ تو اپنا باتاں بند کر چھوڑ سال۔" رئیس عارف نے ہنستے ہوئے بیٹے کو جھڑکا۔

"بابا! ایویں تو نہ لا لیاں دے سامنوں۔ اے پہلے ای سر چڑھی ہوئی اے۔" (بابا یوں تو نہ کہیں اس کے سامنے یہ تو پہلے ہی سر چڑھ گئی ہے۔)

"میڈی خواہش تو دھی نے پوری کیتی اے تا فیروز!"

"میڈا پت بھی ایڈی زمیناں سنبھالدا اے اوہ کوئی نکا کم اے۔" (میرا بیٹا بھی اتنی زمینیں سنبھالتا ہے یہ کوئی چھوٹا کام ہے) اس کی ماں نے جلدی سے کہا۔

"ویکھیں بابا! ماں نوں تو ہر صورت بھائی ہی اچھا لگنا ہے۔" اس نے ناراضگی کی تو وہ ہنس پڑے۔

"کملی! ماں کے معاملے میں ہم نہیں بول سکتے۔ میری مجبوری ہے نا!"

وہ باپ کے کہنے پر کھلکھلا کر ہنسی۔

"ہاں بابا! ایک تو مبارک ہو دونوں کو میڈیکل میں داخلہ مل گیا ہے۔" "اوئی نادیہ بھی خبر سن کر آئی تھی۔"

"ہاں اوئی آ گئی خیر مبارک۔" وہ ہنس کر اس کے گلے لگیں۔

"اوئی نادیہ بجلی کر ہیں۔" رئیس عارف نے اٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"اوا بھلائی کر آج میں بھی مٹھائی کھا کر جاؤں گی۔"

"بابا اوئی کیوں نہیں۔ وجیہو مٹھائیاں۔ میں ابھی فیروز کو مالکی بھیجتا ہوں مٹھائی لینے مگر اوئی آج ہمارے ہاں صرف مٹھائی نہیں روٹی بھی کھا کر جانا عائشہ اوئی کی پسند کی چیز پر فیروز کو کہو وہ لے آئے۔"

"ہاں عائشہ! دیکھ کی آج تو اوا عارف بڑا خوش ہے۔" نادیہ ہنسی۔

"اوئی! وہی تو میرے بچے ہیں ان کی خوشیوں میں خوش نہیں ہوں گا تو پھر کن کی خوشیوں میں خوش ہوں گا۔"

"بابا! اوا! تو ہی تو میرے بھائی ہو پھر تمہاری اولادیں بھی وہ اور وہ جو گیا تو پھر لوٹ کر نہ آیا اس کا بھی ایک دانہ ہے۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ بابا کے تو وہی پوتے ہوئے نا۔" نادیہ نے گہری سانس لی۔

اس نے دیکھا۔ بابا ایک دم چپ سے ہو گئے اور اماں وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

اور [illegible] اک اچھوت ہاسٹل میں چھوڑنے آئے تو اس نے منت کر کے پوچھ لیا۔

"بابا! اس شہر میں چاچا بھی تو رہتے ہیں۔ آپ اگر دوسرے ہاسٹلز سے مطمئن نہیں تھے تو مجھے وہاں بھی چھوڑ سکتے تھے۔"

[illegible] ہو گئے۔

[illegible] عارف مصطفیٰ [illegible] سے جیسے [illegible] تعلق ہے۔ [illegible] نے تمہارے ساتھ کوئی [illegible] تم بھی جانتے ہو کہ وہاں [illegible] تعلق کیوں تو [illegible] تو چاہتے ہم سے [illegible] زندگی میں کوئی پیار یا محبت کرتے اس سے [illegible]

[illegible] لوگ ہوتے ہیں مگر [illegible] ہیں۔ ہم [illegible]

[illegible] دل رہے [illegible] وہ خاموش [illegible]

"ٹھیک ہے بیٹا اب تم جاؤ اور اپنا کمرہ دیکھو میں [illegible] میڈم حمیدہ سے مل لوں۔ اور یہاں پھر آفس [illegible] میڈم حمیدہ سے تمہارا تعارف بھی کروا [illegible]"

ایک تین منزلہ بنگلہ تھا۔ جس کی دو اوپر والی منزلوں [illegible] ڈال کر ہاسٹل کا درجہ دیا [illegible] جس میں میڈم حمیدہ کا بیڈ روم [illegible] ڈرائنگ روم تھا جس میں ہاسٹل میں رہنے [illegible] ملنے والے بھی آکر بیٹھتے اور جس کو [illegible] ڈرائنگ روم کہتیں۔ باقی کے دو کمروں میں ایک میڈم حمیدہ کا گیسٹ روم تھا۔ جس میں بھی [illegible] کے مہمان اگر رات کو رکتے کیونکہ میڈم [illegible] مہمان داری کی قائل نہیں تھیں اور [illegible] کمرے میں بڑا سا ٹی وی رکھ کر اسے ٹی وی لاؤنج کا نام [illegible] اس ٹی وی لاؤنج میں بھی لڑکیاں شاذ و نادر ہی [illegible] اس لیے کہ میڈم حمیدہ کا مزاج ہی [illegible] تھا کہ ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیاں اس [illegible] رکھتیں کہ ان کا سامنا کم سے کم ہو البتہ

میڈم حمیدہ کا رویہ ملازموں سے بڑا اچھا رہتا کیونکہ وہ [illegible] کا مظاہرہ کر کے پیسہ کم دیتیں اور کام زیادہ [illegible] وہ اس ہنر سے واقف نہیں کہ کام پڑنے پر گدھے کو باپ کیسے بنایا جاتا ہے۔ البتہ وہ ہاسٹل کی لڑکیوں پر بڑا سخت پہرہ رکھتیں۔ کون کس وقت یونیورسٹی سے فارغ ہوتی ہے۔ کس کی کیا جاب کا کیا وقت ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ذرا دیر ہو جاتی تو آتے ہی وہ آفس کی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھنے والے انداز میں استفسار کرتیں۔

"میڈم! راستے میں دیر ہو گئی۔ ٹریفک جام تھا یا راستے میں بس خراب ہو گئی۔" آنے والی جلدی جلدی صفائی پیش کرتی۔

[illegible] کر یوں بھاگتی کہ جیسے پیچھے سے [illegible] میڈم کو غصے سے "ہونہہ" "ابھی اور دیر سے آتیں" کہتی [illegible] بھی سن لیں۔

اور کمرے میں آکر جو لڑکیاں ان کا ریکارڈ لگاتیں [illegible] طرح کے نام رکھ کر ان کی جو بھڑاس نکالتیں۔

اس کے ابتدائی دن تو سکون سے ساتھ گزر گئے اس کی روم میٹ جو ابھی چھٹیوں پر گاؤں گئی ہوئی تھی۔ البتہ اسے یہ فکر ضرور تھی کہ پتہ نہیں وہ مزاجاً کیسی ہو اور اس کے ساتھ وہ گزارا کر بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن ہاسٹل کی دوسری لڑکیوں نے سامنے [illegible] کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔

☆ ☆

کہتے ہی وہ [illegible] اندھیرا صرف اس کے کمرے میں ہی نہیں اس کی زندگی میں بھی در آیا تھا۔ پچھلے تین گھنٹوں سے سیف مصطفیٰ یونہی اوندھے منہ پڑا تھا اس نے کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ وہ یوں سکتے کے عالم میں پڑا تھا کہ دل کی دھڑکن کی آواز اسے واضح طور پر سنائی دیتی تھی جیسے وہ بھی بین کیا کر رہی ہو۔

اس کا سارا جسم انجانے درد سے دکھ رہا تھا۔

"وہ میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہے؟ کیسے مجھے یقین کر لیا اس کے لفظوں پر۔ کیا میری محبت اتنی کمزور [illegible] کیا میرے خلوص میں کوئی کھوٹ تھا؟ میں نے تو محبت کو پوری سچائی سے برتا تھا پھر۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا عنیزہ عارف! کیوں کیا تم نے ایسا؟" اس کے دل میں اسی سوال کی ہوک سی اٹھی اور کانوں میں اس کی آواز۔

"مجھے نہیں کیا پتہ سیف مصطفیٰ! میرا اعتبار کرنے میں تم کو کیا ہے۔ تم بھی تو اس کے دوست ہو اس سے [illegible] کیسے ہو سکتے ہو۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی اس لیے کہ جہاں بے اعتباری کا موسم در آئے وہاں محبت ہار جاتی ہے اس لیے تمہارے اور میرے راستے جدا ہو چکے ہیں۔"

اور سیف مصطفیٰ کو یقین نہیں آیا تھا کہ عنیزہ عارف اس کے ساتھ یوں بھی کر سکتی ہے۔ بغیر کسی غلطی کے اسے وضاحت کا موقع دیے بغیر قرار دے کر اسے سزا سنا دے گی۔ اس کی آنکھیں گم ہو گئی تھیں۔ اس وقت وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ

"نہیں عنیزہ عارف! تم مجھے صرف اک مرد ہونے کی سزا نہیں دے سکتیں۔" وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ "محبت کے ان دو سالوں میں کبھی بھی میں نے کوئی ایسی اوچھی حرکت کی ہے عنیزہ عارف! کہ جس سے سیف مصطفیٰ کی ہوس جھلکنے لگے۔" مگر وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہا تھا۔

وہ صرف فیصلہ سنانے کے لیے آئی تھی اور سنا کر چلی گئی اور وہ اپنے خوابوں کی راکھ اٹھاتے بمشکل ڈرائیونگ کر کے گھر پہنچا تھا اور تب سے بے سدھ پڑا تھا۔

اس سے پہلے اس کا ذاتی ملازم اسے تین بار کھانے کو پوچھنے آیا تھا۔ مگر ہر بار وہ کہتا۔

"خان! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

"سیف... سیف بیٹا!" غلام مصطفیٰ اندر داخل ہوئے تو اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ انہوں نے [illegible] بٹن دبایا [illegible] لگتے ہی کمرہ روشن ہو گیا۔

"سیف!" انہوں نے غور سے دیکھا۔ اوندھے منہ لیٹے ہوئے اس کے وجود میں اس پکار پر کوئی جنبش نہ ہوئی تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے بیڈ پر بیٹھے۔

"سیف بیٹا! طبیعت ٹھیک ہے؟" انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

"سیف...!" ان کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔ انہوں نے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ موڑا تو اس کا وجود شدید گرم محسوس ہوا۔ انہوں نے ایک دم گھبرا کر اسے سیدھا کیا۔ سیف مصطفیٰ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کا سارا وجود جل رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر ملازم کو آواز دی۔ خان محمد دوڑتا ہوا آیا۔ وہ اس کی مدد سے اسے اسپتال لے آئے۔

"کوئی بات نہیں رئیس غلام مصطفیٰ! پریشانی کی بات نہیں ہے بخار اتر جائے گا۔" ڈاکٹر عبدالقادر نے انہیں دلاسہ دیا۔

"کل تک تو ٹھیک تھا۔ پھر اچانک اس کی یہ حالت..."

"مگر میں [illegible] نہیں کرتے۔ تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔" ڈاکٹر عبدالقادر نے مسکرا کر ان کا شانہ تھپکا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو یا صرف مجھے دلاسہ دے رہے ہو؟" انہوں نے مشکوک نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

"یہ تمہاری شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔ ارے یار! کبھی تو اعتبار کرنا بھی سیکھو۔ میں ڈاکٹر ہوں بچپن سے اس کا علاج کر رہا ہوں۔ یہ ہمیشہ بے احتیاطی کی وجہ سے بیمار ہو جاتا ہے۔ چلو آج رات تمہارے اطمینان کے لیے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ صحیح ہے۔" انہوں نے فوراً تائید کی۔

پھر وہ ساری رات ماضی کی گرد ہٹاتے رہے۔

"سر! آپ لیٹ جائیں۔ ہم ہیں ناں بیٹے کا خیال رکھنے کے لیے۔" ڈیوٹی ڈاکٹر نے ان سے کہا۔

"نہیں! مجھے نیند نہیں آرہی۔" انہوں نے سہولت سے منع کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

اور ماضی کا اک خوب صورت منظر ان کے سامنے

[illegible] گویا وہ [illegible] نے ان کی [illegible] بچپن سے بہت ہی [illegible] انھوں نے اسے [illegible] شادی اور [illegible] دی۔ [illegible] انھیں کی بیوی بول [illegible] شروع کیا [illegible]

[illegible] آپ [illegible] سے بچے کو [illegible]

[illegible] نہیں ہوتے۔"

"نہیں، نہیں ہوتے۔" [illegible] مٹھائی دے کر [illegible] انھوں نے [illegible]

[illegible] وہ بڑی [illegible] کے لیے [illegible] ہوں۔" "[illegible] میں مجھ سے [illegible] وہ خوشی سے نہال ہو [illegible] بیٹے نے۔

"اماں! آپ کو کیسے پتا کہ میرے یہاں اولاد ہونے والی ہے؟"

"تیرے بابا کی اطلاع بھی کسی نے اپنا لیا۔ خوشیوں سے [illegible] نہیں۔ [illegible] سب نے خوب [illegible] مصطفیٰ! ان کا حصہ [illegible] نہیں دوں گی۔ غلام [illegible] کے زیورات بھی الگ ہوں۔ وہ تیرا [illegible] میری ماں اب ضد چھوڑ دے، چل کر باپ کو منالے۔"

"میں آپ کے کہنے پر ہر بار میں جاتا ہوں مگر ہر بار کہتے ہیں 'میرا ایک ہی بیٹا ہے جو میرے ساتھ رہتا ہے' [illegible] میں کب [illegible] آ [illegible] گا۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔"

"ہاں! تمہارے باپ کی ضد بڑی خراب ہے۔ وہ مجھے بھی تھوڑی آنے دیتے تھے مگر بیٹا! میں نے سامان باندھا اور آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تیرے باپ کو میں نے صاف کہا اب اگر آپ مجھے گھر سے نکال بھی دیں گے تو بھی میرے غلام مصطفیٰ کا گھر ہے۔ وہ وقت کی روٹی ضرور کھلائے گا وہ مجھے۔ بس اب نہیں رکوں گی۔ پھر تو نے گاڑی بھی بھیجی تھی۔" وہ مسرت سے بولیں۔

"کل! میرا نہیں آپ کا گھر ہے۔ اس پر آپ کی حکومت چلے گی۔" وہ ماں کی باتیں [illegible] لگے تھے۔

اور وہ جتنے دن رہیں۔ سال [illegible] ہو گئی خوب [illegible] مریم بڑے شوق سے ان سے گاؤں کی باتیں پوچھتی۔

اور پھر وہ گئیں تو ایسی گئیں کہ واپس لوٹ کر نہیں آئیں۔ انھوں نے کئی بار ڈرائیور کو بھیجا مگر وہ بیمار تھیں۔ میں [illegible] کی دن۔ مگر اس دن سے پہلے وہ چل بسیں اور انھیں بتایا بھی نہیں گیا۔ گاؤں کا کوئی دوست سب سے چھپ کر انھیں بتا گیا۔ وہ روتے ہوئے گاؤں پہنچے تو جنازہ اٹھ چکا تھا۔ وہ گاڑی دوڑاتے ہوئے قبرستان پہنچے تو دعا کی بار [illegible] تھی۔ انھوں نے نم آنکھوں سے [illegible] کو چھوتے ہوئے دعا میں شرکت کی اور [illegible] ہوئے انتہائی صدمے کے عالم میں [illegible] گیا۔

"اماں! آج کے دن بھی آپ نے مجھے نہیں بلوایا۔ اب میں کبھی بھی اس گاؤں میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ آج سے [illegible] آپ نے مجھ سے تعلق توڑا تھا مگر آج میں ہر تعلق توڑ کر جا رہا ہوں۔"

اور وہ اپنے عہد کے ایسے پکے نکلے کہ پھر لوٹ کر گاؤں نہیں گئے۔

ماں کے چہلم کے بعد انھیں اپنے حصے کی زمینوں کی کاغذات ملے تو وہ حیران رہ گئے۔ تب انھیں بعد میں پتہ چلا کہ ان کے باپ نے ان کی ماں کو چھ ماہ پہلے ہی ان سے کہا تھا کہ "غلام مصطفیٰ سے ملنے جاؤ تو میں اسے جائیداد کا حصہ دے دوں گا۔"

اور وہ ایسی بھلی مانس کہ اس ایک بات کو لے کر بیٹھ گئیں۔

اور جب چند سال بعد جب وہ بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہوئے تو وہ انھیں دیکھنے جاتے اور روزانہ گھر سے کھانا بنوا کر لے جاتے۔ وہ ان کے سر پر ہاتھ رکھتے دعائیں دیتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے مگر جب اسپتال میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تو وہ وہیں سے چلے گئے۔ ویسے بھی ماں باپ کے بعد گاؤں میں اب ان کا رکھا کیا تھا۔ سوائے ایک بھائی کے جس کی وجہ سے وہ [illegible] کٹ رہے تھے۔

ان کی ساری خوشیاں اب مریم اور سیف تک ہی وقف ہو گئی تھیں۔

بینک کی جاب ان کا شوق تھی پھر ضرورت بن گئی مگر جب ان کا حصہ انھیں مل گیا تو پھر ضرورت نہ رہی تھی لیکن وہ جاب کرتے رہے البتہ ان کا جاں نثار ملازم خان محمد ہی جائیداد کے سارے معاملات وہ سنبھالتا۔ انھیں تو گھر بیٹھے رقم مل جاتی تھی۔ سیف کے بعد ان کے آنگن میں کوئی اور پھول نہیں کھلا۔ سو ان کی ساری توجہ کا مرکز سیف ہی ہوتا۔

وہ ہر بات سے واقف رہنے کی کوشش کرتے جب وہ اپنے شوق سے میڈیکل میں آیا تو زیادہ مصروف ہو گیا۔ اس کی شامیں اکثر باہر گزرتیں۔ جب وہ شکوہ کرتے تو وہ ہنس کر کہتا۔

"بابا! دوستوں کے ساتھ اسٹڈی کرنے جاتا ہوں۔"

مریم بگڑتیں "جوان لڑکا ہے چھوڑیں۔ کیوں اتنی پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اس دور میں تو اتنی پوچھ گچھ لوگ لڑکیوں سے نہیں کرتے۔" آپ بیٹے کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔"

اور وہ کہتے۔ "یہی تو عمر ہوتی ہے لڑکوں کے بننے اور بگڑنے کی۔ جب لڑکوں کی ہر خواہش پوری ہو رہی ہو تو وہ کچھ ایسی خواہشیں پال لیتے ہیں جو جان کا روگ بن جاتی ہیں۔"

وہ اچانک چونک کر ماضی کی گلیوں سے باہر آگئے سیف نے کچھ کہا تھا۔ انھوں نے قریب ہو کر سننے کی کوشش کی۔

"تم ۔۔۔ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔"

انھوں نے غور سے بیٹے کو دیکھا۔ جو کچھ وہ غنودگی میں کہہ رہا تھا وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ "کیا سیف کسی کو پسند کرنے لگا تھا۔ مگر مجھے اس بات کا علم کیوں نہ ہو سکا؟"

* * *

وہ چند دنوں میں ہی صائمہ جبیں سے گھل مل گئی تھی۔ حالانکہ دونوں کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا۔ وہ پارہ صفت اور یہ مستقل قرار، وہ طبعاً ہنس مکھ کھلنے والی، یہ سنجیدہ مزاج کم گو رہنے والی۔ اس فرق کے باوجود دونوں میں دوستی ہو گئی۔ صائمہ اکثر اسے چھیڑتی۔

"سنا ہے ناولوں میں وفا کم کہانی جاتی ہے۔"

"غلط سنا ہے تم نے۔ آزما کر تو دیکھو۔" وہ فوراً تردید کرتی۔

"یعنی آزمانے کے لیے مجھے کسی ناول سے دل لگانا پڑے گا؟" وہ صدمے سے دیدے پھاڑ کر شرارتاً کہتی۔

"کسی اور سے نہیں مجھ سے۔" وہ ہنس کر اس کے بیڈ پر آبیٹھی۔

"کیا خاک مزہ آئے گا۔" وہ برا سا منہ بنا کر کہتی تو عفیفہ عارف بے ساختہ ہنستے ہوئے اسے تکیہ کھینچ مارتی۔

پھر اچانک صائمہ جبیں اپنی شامیں باہر گزارنے لگی۔ شروع شروع میں تو اس نے توجہ نہ دی کہ وہ گھومنے پھرنے، شاپنگ کرنے اور کھانے پینے کی شوقین تھی۔ مگر جب وہ کالج سے آ کر شام کو مستقل باہر جانے لگی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ چونکہ دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنا اس کی عادت نہیں تھی اس لیے کبھی اس نے صائمہ سے پوچھا نہیں تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ صائمہ کی پڑھائی میں بھی پہلی سی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اکثر کتاب کھولے سوچ میں گم ہوتی۔

"یہ پڑھائی ہو رہی ہے؟" وہ ڈانٹ کر کہتی تو وہ جان بوجھ کر زور سے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اس طرح اچھلتی کہ اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب زمین پر جا گرتی۔ اور وہ اس کی لاجواب ایکٹنگ پر ہنس پڑتی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اندر سے انسان کتنا بدصورت ہے۔ نیلا، پیلا، لال، سبز رنگ، رینگتے بڑیاں، گوشت۔ اونہوں سوچوں تو متلی ہونے لگتی ہے۔" وہ بڑی معصومیت سے منہ بنا کر کہتی تو عفیفہ عارف ہنس پڑتی۔

"بڑی فنکار ہو تم۔ ویسے کہتی سچ ہو۔ اللہ سائیں نے

انسان کو کمال کی پوشاک پہنا کر خوب صورت بنا دیا ہے۔

چنگیز صاحب کے بدلے ہوئے رویے سے اسے تشویش ہونے لگی تھی۔ اور تو اور اس کے معاملات میں وہ چنگیز خان کی بھتیجی میڈم حمیدہ بھی کچھ نہ بولتیں۔

"آج آئے تو ضرور پوچھوں گی" اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔ رات کے نو بج رہے تھے اس نے ٹہلتے ہوئے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔

صائمہ ٹو ڈی سیلون سے اتر رہی تھی اور اس نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے کھڑکی سے سر نکالا، ہاتھ ہلایا اور گاڑی زن سے بھگا لے گیا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا کہ چوکیدار اب گیٹ بند ہے مگر وہ سر جھکا کر تالا کھول رہا تھا۔

وہ خاموشی سے آ کر لیٹ گئی۔ چند منٹ بعد صائمہ گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" اس نے غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

"حیدر آباد سے۔" اس نے بندے اتار کر میز پر رکھتے شرارت سے کہا۔

"اچھا یہ تو نئی خبر ہے۔" وہ جل گئی۔ "ہائے اور ہم رہتے کہاں ہیں؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"حیدر آباد میں۔" صائمہ نے ہنستے ہوئے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔ تو پیچھے سے عنیزہ عارف نے غصہ سے رخ بدلا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے منہ دھو کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

"ہاں محترمہ عنیزہ عارف مغل صاحب! غالباً آپ ناراض ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے گدگدی کی۔

"جی نہیں ہماری ایسی مجال کہاں؟" وہ خفگی سے بولی تو صائمہ کے جلے بھنے انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"محترمہ بندی حاضر ہے آپ کی خدمت میں۔ تفتیش کر سکتی ہیں۔"

"صائمہ! اگر میں تم سے کوئی ذاتی سوال کروں تو؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ عنیزہ عارف کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہے تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو اور تمہیں یہ حق حاصل ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے تمہیں پتہ ہے تو تم خود ہی بتا دو۔" وہ سنبھل کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے سہیل اچھا لگنے لگا ہے۔ ہاں عنیزہ میرا دل میرے قابو میں نہیں رہا۔" صائمہ نے دھیمے سے کہا۔ اس کے انداز میں پشیمانی تھی۔

"تم روز اس سے ملنے جاتی ہو؟" عنیزہ نے کہا تو "ہوں" وہ خاموش رہی۔

"صائمہ! ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہاں اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ ہم پڑھنے کے بجائے ادھر ادھر کی چیزوں میں انوالو ہو جائیں۔"

"اور مجھے میری ماں نے کوئی ایسی نصیحت نہیں کی تھی کہ کسی سے دل نہ لگانا محبت نہ کرنا۔" وہ اپنی بیزاری سے بولی۔

"مجھے پتہ ہے تم اکلوتی وارث ہو ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بھلا یہ چنگیز خان (میڈم حمیدہ) نے کس خوشی میں تمہیں اتنی چھوٹ دے رکھی ہے؟"

"پیسہ۔" وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ "پیسہ بہت بڑی چیز ہے میری جان! اسی سے آپ لوگوں کو خرید بھی سکتے ہیں۔ ان کے منہ بھی بند کر سکتے ہیں۔"

"جی ہاں، ضمیر فروش لوگوں کو۔" اس نے جل کر کہا۔

"میں نے اس سے کہا ہے جس وقت بھی گیٹ کھلا ہوا ملنا چاہیے۔ میرے معاملات میں تمہیں کان اور زبان بند رکھو اور جیسے گھر والے نے میرے بارے میں پوچھنا، کہو تو میں تمہیں طے شدہ رقم سے دگنی رقم دے سکتی ہوں اور

ہو گی۔" وہ اطمینان سے بولی [illegible] ستاروں کی

اس بات سے صائمہ کو منع کرتی تھی۔ [illegible] اس نے [illegible] سمجھانا چاہا [illegible] ایک [illegible] محبت [illegible] اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ [illegible]

بھولی۔

اس نے خود کو سمجھایا اور شاید وہ خود کو سمجھانے [illegible] سیف مصطفیٰ بھی اس کا محبوب بھی ہو جاتا۔ [illegible] اور صائمہ اس کی [illegible] کرتی۔ "محبت کوئی جرم نہیں عنیزہ عارف! [illegible] تم یوں [illegible] دنیا کو قبول کرو کہ محبت تم پریشان ہوئی۔"

ہی کی ان باتوں کے بعد عنیزہ عارف اس ان [illegible] کے بعد وہ کالج گئی اور پھر سیف مصطفیٰ کی گاڑی میں صائمہ کے ساتھ بیٹھ کر [illegible] تھی۔ وہ اکیلی ہوتی تو مر جاتی مگر کبھی بھی سیف مصطفیٰ کی آفر قبول نہ کرتی مگر اس کے ساتھ صائمہ تھی۔ سیف، سہیل اور صائمہ اس سے ایک سال سینئر تھے مگر صائمہ کی روم میٹ اور دوست ہونے کی وجہ سے وہ ان کے گروپ میں ہی زیادہ نظر آتی۔ دوسری بات کہ سیف مصطفیٰ اور سہیل مزاری کی پکی دوستی تھی اور جب سہیل چند دن کے لیے گاؤں چلا جاتا تو صائمہ تک اس کی خیر خیریت سیف کے ذریعے ہی پہنچتی تھی۔ سہیل مزاری میں جو چیز تھی وہ وڈیروں کی پہچان ہوتی ہے۔ اس کے مقابل سیف مصطفیٰ دھیمے مزاج کا سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ جس میں جنوبی سندھ کی ملائمت تھی اور سہیل مزاری میں شمالی سندھ کی گرماہٹ شامل تھی۔ وہ صد درجہ جوشیلا اور جذباتی تھا۔

اس کا اندازہ اسے دو تین ملاقاتوں میں ہی ہو گیا تھا۔

بڑے [illegible] کے تجزیے کے بعد اس نے صائمہ سے بات کا اظہار بھی کیا تھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ "تم ٹھیک ہو۔ مرد [illegible] اپنے فیصلوں میں شدید اور [illegible] نہیں [illegible] تمہارے سیف کی طرح [illegible] شکل [illegible]"

اس نے [illegible] سیف [illegible] کر [illegible]

اور وہ اس کی [illegible] ہوئی۔ اور جب اس نے [illegible] کالج کے علاوہ باہر ملنے سے انکار کیا تو صائمہ حیران ہوئی۔

"تم پاگل ہو عنیزہ عارف! اتنی اچھی محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔ باہر ملنے میں کیا حرج ہے؟"

"ہم خود کو محبت کرنے سے نہیں روک سکتے مگر غیر اخلاقی، غیر اسلامی اور معاشرتی روایات سے متصادم حرکتوں سے تو روک سکتے ہیں نا۔"

"تم بے کار کی ضد کر رہی ہو عنیزہ!" وہ [illegible] بولی۔ "سیف نے میرے کان کھا لیے ہیں کہ تمہیں راضی کروں۔ بھلا اس میں برائی بھی کیا ہے؟ اگر کبھی سیف سے ملنے چلی جاتی ہو نا۔ بس چند گھنٹے کسی پارک میں یا ریسٹورنٹ یا سمندر کنارے بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو حال دل سناتے ہیں اور [illegible] کرتا ہے۔"

"تم میری بات نہیں سمجھ سکتیں صائمہ۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا تو پھر سمجھاؤ تم!" وہ بری طرح چڑ گئی۔

"دیکھو! کہیں بھی کسی نے دیکھ لیا۔ میرے بابا نے، بھائی نے یا کسی رشتے دار نے تو کیا غضب نہیں ہو گا؟ ہم جب اپنے پسماندہ علاقوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے نکلتے ہیں تو ہم پر بہت بھاری ذمہ داریاں پڑ جاتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تمہاری یہ نرالی منطقیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ہم ان سے [illegible] میں ملتے ہیں۔ لائبریری میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں تو پھر کسی شام کو کہیں باہر ان سے ملنے میں کیا مضائقہ ہے۔"

"کالج کی بات اور ہے۔ وہاں ہم پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ کسی سے ملنا یا بات کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ کسی سے کام بھی ہو سکتا ہے مگر اس سے باہر ملنا غلط بات ہے۔"

"تمہیں تو محبت کرنا ہی نہیں چاہیے تھی عنیزہ! [illegible] ہوتا تم۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا مگر اب دل مانتا ہی نہیں کوئی محبت۔" وہ افسردہ سی ہوئی۔

"سچ ہی تو کہتی ہوں۔ محبت کے آگے ساری منطقیں، سارے دلائل بے کار ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑا انوکھا جذبہ ہے۔ آپ سے اپنا آپ بھی چھین لیتا ہے۔"

اور عنیزہ عارف کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک [illegible] کاش وہ بھی صائمہ جبیں کی طرح محبت کے اس انوکھے جذبے کو پوری آزادی سے بھرپور طریقے سے محسوس کر سکتی۔ صرف محبت کی روشنی میں مست ہوتی۔ مگر دل پر عقل غالب آ جاتی تو اسے لگتا جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ اپنی روایات سے بغاوت کی ہو اور اپنے [illegible] والدین کو دھوکا دیا ہو۔ وہ اپنی جگہ پوری [illegible] گئی۔

دوسری طرف وہ ایک دن سیف مصطفیٰ کو نہ دیکھتی تو بولائی بولائی سی پھرتی۔ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی اور پھر اس سے بات کر کے جب مطمئن ہو جاتی تو اپنی بے خودی پر خود ہی ہنس پڑتی۔ محبت اتنی دیوانی ہوتی ہے۔ اتنی محبت کے باوجود وہ سیف مصطفیٰ سے کہیں باہر ملنے کو تیار نہ ہو سکی۔

بالآخر اس کا حل بھی صائمہ جبیں نے ڈھونڈا اور [illegible] چنگیز خان کی آنکھوں پر پیسوں کی ایک پٹی باندھ دی۔ [illegible] دن کے وقفے سے شام کو سیف اس کے [illegible] ڈرائنگ روم میں عنیزہ کو منتظر ملتا۔ وہ دونوں ادب، سیاست، ملکی مسائل پر گھنٹوں باتیں کرتے۔ محبت محسوس کرنے کی چیز ہے۔ سو [illegible] محبت ہی کی [illegible] خواہ گفتگو کسی موضوع پر ہو اور جب بھی وہ شاہ لطیف کی بات کرتے ایک دوسرے کو بیت [illegible] سناتے تو ان کے پور پور سے محبت چھلکنے لگتی۔

"شاہ کا سارا رسالہ صرف محبت ہے۔" وہ کہتی تو سیف مسکرا کر اسے دیکھتا۔

"مجھے تو لگتا ہے تم بھی شاہ کی کوئی سورمی ہو۔"

"اچھا!" وہ بے ساختہ ہنس دیتی۔ "شاہ کی تو بہت ساری سورمیاں ہیں، میں کون سی والی ہوں؟"

"تم از کم لیلاں نہیں جس نے نولکھے ہار پر اپنا محبوب دے دیا تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا۔

"مگر سیف! تم پر بھی تو [illegible] پھر اس نے بغیر منانے کو کیا کیا جتن کیے۔ مجھے ہمیشہ اس کا رقص [illegible] حیرت میں مبتلا کرتا ہے۔" اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"جب ناچتے ناچتے لیلاں اپنی جان محبوب کے قدموں میں نچھاور کر دیتی ہے۔ اور پھر محبوب بھی اس کی یہ محبت دیکھ کر اپنی جان ہار دیتا ہے۔" اس کی [illegible] تم ہو [illegible] نہیں۔

"ہاں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت زر و جواہر پر اپنا محبوب بھی دے سکتی ہے۔ زیورات اس کی کمزوری ہوتے ہیں نا۔" سیف اسے اداسی سے نکالنے کی خاطر چھیڑتا۔

"جی نہیں۔" وہ چڑ کر کہتی۔ "ماروی بھی تو شاہ کی سورمی ہے نا جس نے اپنی پھٹی پرانی پیوند لگی چادر کو کمخواب، زر و جواہر پر فوقیت دی اور عمر کو صاف جواب دے دیا کہ میں تیرے محلوں کو اپنے جھونپڑے پر قربان کر دوں گی۔"

سیف کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ "تو تم لیلاں ہو یا ماروی؟" وہ شرارت سے کہتا۔

"ماروی!" وہ فخر سے کہتی۔

"تو کہنا نہیں مجھے چھوڑ دو گی۔" وہ جان بوجھ کر اسے چڑاتا۔

"جی نہیں۔ ماروی نے عمر اور اس کے محلات کو چھوڑا تھا اپنے منگیتر کو نہیں۔" وہ کہہ کر چڑ جاتی۔

سیف کے بلند قہقہوں پر وہ کھسیا گئی۔

"تو کیا خیال ہے اگر تم کو چھپنے کے بارے میں سے

[illegible] کی میں اپنے دل [illegible]
بہت عرصہ بعد [illegible]
[illegible] تو نہیں؟"

* * *

عبدالرحیم آئے تو [illegible] خان محمد جو وقت اس
کے [illegible] اس کے ساتھ [illegible]
کے [illegible] سے خان محمد کی
[illegible] ہو گئی۔

"بابا میں ٹھیک ہوں۔ سوچ رہا ہوں کل سے [illegible] جانا شروع کر دوں۔" وہ ان کے پہلو کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں بیٹا ابھی نہیں کچھ دن اور ریسٹ کرو [illegible] کے لیے تو [illegible]"

"[illegible] بابا اب میں ٹھیک ہوں بہت حرج ہو گیا ہے پڑھائی کا۔" اس نے [illegible] سے [illegible] پلیٹ میں [illegible]

"کوئی حرج نہیں ہو گا۔ میں نے بات کر لی ہے تمہارے پروفیسر سے۔ ویسے بھی چند دن بعد تمہاری ماں اور ماموں عمرے سے آ رہے ہیں۔ چلو کراچی چلتے ہیں۔ وہاں تم ماموں کی فیملی کے ساتھ رہو گے تو تمہارا بھی دل بہل جائے گا۔ گھر میں تو اکیلے ہی پڑے بور ہوتے رہتے ہو۔"

"نہیں بابا آپ جائیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔ ویسے ان لوگوں کو [illegible] سے ریسیو کرنے جاؤں گا۔" اس کا دل اچانک کھانے سے اچاٹ ہو گیا۔

"ارے ارے کھانا تو کھاؤ۔"

"بس بابا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ "میں تو تنہائی کو ترس رہا ہوں کہ اس کی یادوں سے کچھ پل بہلا سکوں اب تنہائی کیسے بری لگتی ہے۔" اس نے والٹ نکال کر اس کی تصویر کو دیکھا۔

"تم اندر کیوں آ گئے ہو؟"

"[illegible] بابا [illegible] کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"[illegible] کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور تم تو میرے سر پہ کھڑے ہو۔" وہ [illegible] خان محمد جھک کر باہر نکل گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

"تمہارے سوا [illegible] مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے عنیزہ!" وہ تھک کر بیڈ پر آ بیٹھا۔

"کہاں چلی گئی ہو تم [illegible]"

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ [illegible] اس نے والٹ میں لگی اس کی تصویر نکالی۔ وہ بے بسی کی حد تک اس کے ہجر میں رو رہا تھا۔ آنسو [illegible] اس کی گود میں گر رہے تھے۔

دوسرے دن جب [illegible] غلام مصطفی [illegible] ایم سی چلا آیا۔

"شاید اس نے فیصلہ بدل دیا ہو پھر سے پڑھائی شروع کر دی ہو۔"

"فراز!" اس نے عنیزہ کے کلاس فیلو کو آواز دی۔

"ارے [illegible] تم [illegible] کیا حال ہے طبیعت ٹھیک ہے اب تمہاری؟"

"ہاں اب میں ٹھیک ہوں۔"

"سہیل کا کچھ پتا چلا؟"

"بھاڑ میں جائے وہ بزدل۔ پتا نہیں کہاں جا کر چھپ گیا ہے۔ تم تم یہ بتاؤ عنیزہ کی کوئی خیر خبر ملی؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں سنا ہے اس نے پڑھائی ہی چھوڑ دی ہے۔"

"ہاں تم نے صحیح سنا ہے۔"

"کیا اس نے تم سے بھی رابطہ توڑ دیا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر کیوں پوچھ رہے ہو اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" وہ مسکرایا۔

اس نے حیرت سے فراز کو دیکھا۔ "اس کو چھوڑ دوں آج تمہیں ہو کیا گیا ہے فراز؟"

"دیکھو بیٹا یہ قصوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ [illegible] چلتے ہیں بڑی زور دار [illegible] تم کی محبتیں شروع ہوتی ہیں یونیورسٹی میں سے [illegible] بعد محبتیں پڑھائی کے دوران ہوتی ہیں۔ پھر پریکٹیکل لائف میں جب آتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔"

"میری محبت مر جانے والی نہیں ہے فراز! میری تو سانسوں میں بسی ہے [illegible] اگر میری محبت مر گئی تو میری تو زندگی ہی ختم ہے۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تم میرے ساتھ چلو گے، شاید ہم اس کے گاؤں کا اتا پتا ڈھونڈ نکالیں۔"

"تو کیا تمہیں اس کے گاؤں کا بھی علم نہیں ہے؟ حیرت ہے سیف!"

"مجھے کیا پتا تھا کہ وہ راستے میں ہی ساتھ چھوڑ دے گی۔ ورنہ [illegible] اس کے گاؤں رشتہ مانگنے کے لیے بھیجتا تو پتا بھی پوچھ لیتا لیکن اس کا موقع ہی نہیں دیا۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"بس اتنا پتا ہے کہ کسی ضلع بدین میں [illegible] کا گوٹھ ہے۔ جہاں رئیس عارف رہتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں عنیزہ اور فیروز۔ عنیزہ کا نام نہیں لے سکتے۔ رئیس عارف اور رئیس فیروز کا پتا پوچھیں گے۔"

"تم نے رئیس عارف کو دیکھا ہے؟" فراز اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں البتہ ایک بار عنیزہ نے مجھے کچھ تصویریں دکھائی تھیں جو شاید اس نے اپنی کسی کزن کی شادی میں کھینچی تھیں۔ اس میں رئیس عارف کا بھی ایک [illegible] پوز تھا۔ وہ کسی سے بات کر رہے تھے وہ تصویر ایسی تھی کہ ایک نظر دیکھ کر ہی انہیں پہچان لوں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے کہا۔

وہ امید و بیم کی کیفیت میں گھرا سارا دن اسے تلاشتا رہا۔ تین چار گوٹھوں میں رئیس عارف نامی لوگ ملے بھی تو وہ نوجوان نکلے یا ان کی سماجی و معاشی حیثیت بالکل ہی نہیں تھی۔ سو وہ نامراد لوٹ آئے۔

رات ہوئی تو وہ واپس لوٹ آئے۔ سیف گھر پہنچا تو [illegible] کے لیے بیٹھا [illegible] رہے تھے اور وہیں غلام مصطفی پریشانی سے باہر ٹہل رہے تھے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے سیف؟"

"بابا وہ دوستوں کے ساتھ ذرا [illegible] تھک گیا ہوں۔" "ارے [illegible]" "میں اب سوؤں گا۔" وہ نظریں چرا کر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"کھانا کھایا ہے؟"

"جی میں نے کھا لیا تھا۔" وہ جلدی سے اندر گھسا کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو نہ دیکھ لیں۔ دروازہ لاک کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ چھوڑ دینے کا درد اور بے مراد سفر نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ملا تھا اسے سارے دن کی مشقت کے بعد کوئی اشارہ بھی نہیں ملا۔

"کہاں ڈھونڈوں میں تمہیں عنیزہ عارف!" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے۔

* * *

"یہ پکڑو۔" صائمہ نے اسے وہ پیکٹ تھمائے۔

"کیا ہے یہ؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کھول کر دیکھ لو تم۔" وہ مسکرائی۔ اس نے فوراً ریپر پھاڑا تو وہ اس کی عجلت پر ہنسنے لگی۔ آسمانی رنگ کا سوٹ میچنگ جیولری شوز پرفیوم اس نے الجھی ہوئی نظروں سے صائمہ کو دیکھا۔ جو چہرے پر کلینزنگ لوشن لگا کر ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔

"سیف نے بھیجا ہے اور اس نے کہا کہ کل جب وہ تم سے ملنے آئے گا تو تم انہیں کپڑوں میں تیار ملو۔"

"تمہیں پتا ہے کہ آج تک میں نے اس سے کوئی گفٹ نہیں لیا اور تم یہ چیزیں کیوں اٹھا لائی ہو۔" وہ ناراض ہوئی۔

"تمہاری ساری منطقیں نرالی ہیں عنیزہ! محبت بھی کی جا رہی ہے ملاقات بھی کی جا رہی ہے۔ مگر ہاں ہر

نہیں ڈرائنگ روم میں۔ جس کی کھڑکیاں جان بوجھ کر کھلی رکھی جاتی ہیں۔" وہ چپ ہوئی تو اس نے افسردگی سے اسے دیکھا۔

"دل کا کاروبار جاری مگر گفٹ لینے دینے سے انکاری۔ ہم شاپنگ کرنے گئے تو سیف بھی ساتھ ہو لیا اور کہا کہ کل عنیزہ کو میں اپنے پسند میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے تو غلطی ہوئی کہ اٹھا کر لے آئی۔ اب تم جانو اور سیف جانے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔" اس نے کہتے ہوئے غصے میں کمبل اوڑھ لیا۔

اور عنیزہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ لہجے کی تلخیوں سے ڈرنے والی۔

دوسرے دن صائمہ صبح سے ہی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ زرد اور سرخ رنگ کے امتزاج والا سوٹ جس پر موتیوں کے ساتھ نفیس کڑھائی کی ہوئی تھی۔ اس نے استری کر کے الماری میں رکھا۔

"تم آج یونیورسٹی نہیں جاؤ گی؟" اس نے ناشتہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں، کون جائے آج بور ہونے۔" وہ بے وجہ ہنسی۔

سچ کہا تھا صائمہ نے وہ خود بھی آخر بور ہوئی تھی۔ سہیل، سیف، صائمہ، اس گروپ سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے بے دلی سے بہ مشکل سے وقت گزارا تھا، ہاسٹل آ کر کھانا کھایا اور سو گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو صائمہ تیار ہو رہی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ صائمہ کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔

"چلو اٹھو، تم بھی تیار ہو جاؤ۔ آخر کو تمہارا سیف بھی تم سے ملنے آئے گا۔ ویسے عنیزہ! تم ہو بہت ضدی۔ آج کے دن تو اس سے کہیں باہر مل لیتیں۔"

اس نے جیولری پہن کر خود پر اسپرے کیا۔

وہ کمبل منہ سے ہٹائے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے جھک کر سینڈل پہنا، لپ اسٹک اٹھا کر پرس میں ڈالی۔

"عنیزہ! جن سے ہم محبت کرتے ہیں ان پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے، ورنہ پتا ہے کیا ہوتا ہے؟" اس نے شرارت سے اسے دیکھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، وہ جھک کر اس کے بیڈ کی طرف آئی "محبت کمزور ہو جاتی ہے پگلی! اب اٹھو بھی، سیف بھی آنے ہی والا ہوگا۔"

اس نے کمبل اس پر سے کھینچ کر اتارا۔

"ہائے، ارے، اٹھتی ہوں، سردی لگ رہی ہے۔" وہ چیخی۔

"ایک تو تمہاری سردی ختم ہونے میں نہیں آتی۔" اس نے برا منہ بنا کر کہا اور لحاف اٹھایا۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ آنکھیں موندے سستی سے لیٹی رہی۔

"عنیزہ بی بی! آپ کا کوئی مہمان آیا ہے۔" ملازمہ جس کے ذمے ان سب کا کھانا اور پیغام رسانی تھا، اسے بلانے آئی تھی۔

"میں آ رہی ہوں پانچ منٹ میں۔" وہ کمبل پھینک کر جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔ تولیے سے منہ پونچھتی وہ ڈریسنگ ٹیبل تک آئی، عجلت میں بال سنوارے، سادہ سے کاٹن کے سوٹ کی شکنیں اپنے ہاتھوں سے درست کیں، اس کے بھیجے ہوئے گفٹ اٹھا کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

صوفے پر بیٹھا سیف اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تھینک یو۔" اس نے مسکرا کر پھول اور کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے لب بھینچے اس کے سادہ سے روپ کو خوشی اور ناراضی کی ملی جلی کیفیت سے دیکھتا رہا۔

"بیٹھو نا، تم کھڑے کیوں ہو۔"

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"تمہیں دکھ ہو رہا ہے نا سیف! کہ میں نے تمہارا بھیجا ہوا سوٹ نہیں پہنا۔" وہ کچھ بھی بولے بغیر لب بھینچے خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

"میں یہ سوٹ پہنوں گی مگر جائز حیثیت میں۔ ابھی تم لے جاؤ۔ جب امی کو لے کر آنا تب یہ سوٹ بھی ان کے ہاتھ منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ بھیجنا۔" اس نے کہتے ہوئے نظریں چرائیں۔

سیف کے بھینچے ہوئے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ مچل گئی۔

"کتنی خوب صورت بات کہی ہے تم نے۔" وہ کھل کر ہنسا "مگر سچ پوچھو تو یہ گفٹ نہ لینا تمہاری اپنی سوچ ہے۔ بالکل ہی دقیانوسی خیالات جو اس دور میں نہیں چلتے۔"

"نہیں سیف! یہ بوسیدہ خیالات نہیں۔ تم غور کر کے دیکھو تو کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے بس میں نہیں ہوتیں۔"

"مثلاً؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مثلاً محبت۔"

"اچھا اور۔۔۔؟"

"اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے بس میں والی ہیں۔ تم سمجھو کہ یہ گفٹ نہ لینا ان ہی باتوں میں سے ہے۔"

"تو کیا میری خوشی مقدم نہیں ہے تمہارے لیے؟"

"تمہاری خوشی مقدم ہے تب ہی میں تم سے ملنے آئی ہوں ورنہ میں اتنی جلدی ملنے کی بھی قائل نہیں جب تک ہمارے درمیان کوئی سماجی رشتہ نہ قائم ہو جائے۔"

"محبت سماجی رشتہ نہیں ہے؟"

"نہیں یہ تو قلبی و روحانی رشتہ ہے جو بعض دفعہ دو رشتوں کے تصادم میں آ جاتا ہے۔" وہ چند لمحوں کے سکوت کے بعد گویا ہوئی۔

"محبت میرے لیے مادی چیز نہیں کہ اس کے بدلے میں کوئی مالی یا مادی فائدہ ڈھونڈوں گی۔ ہم میں اور ان عورتوں میں کچھ تو فرق رہنے دو جن کا مشغلہ ہی لڑکوں کی جیبیں خالی کرانا ہے۔ ایسی عورتیں محبت پر مادیت کی قابض ہوتی ہیں۔" وہ افسردگی سے کہنے لگی۔

"اور محبت کن پر قابض ہوتی ہے؟"

"مجھ جیسی عورتوں پر محبت قابض ہوتی ہے جن کے لیے اہمیت ہوتی ہے تو صرف محبت کی۔ کوئی بھی مالی، مادی فائدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا جن کے لیے۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"تمہاری یہ بات بھی پیاری ہے، بالکل تمہاری طرح۔"

اس دن وہ کمرے میں آئی تو اس کے دامن میں بہت خوش کن وعدے بندھے ہوئے تھے اور بہت خوب صورت لمحے جو اس کے دل میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ملازمہ آ کر اسے کھانا دے گئی۔ اس نے چند نوالے لے کر ٹرے واپس کر دی۔ ویسے بھی جس دن وہ بہت زیادہ خوش ہوتی اس دن کھانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ خوشی میں اس کی بھوک اڑ جاتی تھی۔

"اف دس بج گئے، ابھی تک صائمہ نہیں آئی۔" وہ آ کر بستر پر لیٹ گئی، ریموٹ اٹھا کر مختلف چینل بدلتے ان ہی سوچوں میں اسے نیند آ گئی۔

نہ جانے کون سا وقت تھا جب دروازہ زور سے بند ہونے پر اس کی آنکھ کھلی۔

"صائمہ! تم آ گئیں؟" اس نے کمبل منہ سے ہٹائے بغیر پوچھا۔

"ہاں!" اسے لگا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے، "سردی میں آئی ہے شاید اس لیے۔" وہ پھر سو گئی۔

* * *

"سیف کی کوئی خبر لیں۔ کل اس کا دوست، کیا نام ہے بھئی؟ ہاں وہ فراز، اس کا پوچھ رہا تھا کہ بہت دنوں سے پڑھنے نہیں آ رہا۔ وہ ٹھیک تو ہے؟ اب میں کیا کہتی اسے رئیس! کہ گھر سے تو روزانہ اسی بہانے نکلتا ہے۔"

رئیس غلام مصطفیٰ نے سگریٹ ایش ٹرے میں رگڑ کر بجھایا۔

"کہاں ملا تھا تمہیں؟" انہوں نے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر استفسار کیا۔

"کل سینٹر پر ملا تھا۔ ایک دو بار وہ پہلے گھر بھی آ چکا

ہے سیف اور سہیل کے ساتھ اسٹڈی کرتے۔" وہ بیٹھے کیا کچھ پتہ کرو لیں۔

"ہاں۔ ڈاکٹر عبدالقادر نے بھی مجھ سے شکایت کی ہے کہ سیف بہت دنوں سے کالج سے غیر حاضر ہے اور یہ کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے اور ہمیں اس کی الجھن کا پتہ لگانا چاہیے۔ میرے سامنے تو کھلتا نہیں تم سے ہو سکتا ہے تمہیں بتا دے۔ ذرا پوچھ کر تو دیکھو۔" وہ چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگے۔

"پوچھا تو میں نے بھی بہت ہے مگر اس نے بتایا نہیں کہتا ہے اماں! سہیل والا واقعہ میرے دماغ پر چڑھ گیا ہے۔ بس میں چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تو اماں وقت دیں مجھے پھر میرے ساتھ بیٹھتا ہے باتیں کرتا ہے۔ وہ یہ سب مجھے دھوکا دینے کی خاطر کرتا ہے۔ میں ماں ہوں اس کی پریشانی مجھ سے کہاں چھپی رہ سکتی ہے۔"

"پھر بھی تم کوشش کرتی رہو کیا پتہ کسی کمزور لمحے میں اگل جائے۔" انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں سہیل کہاں چلا گیا ہے بیچاری لڑکی نکل گیا ہے۔ رحیم! دیکھو کہیں اس وجہ سے تو سیف پریشان نہیں کہ کہیں سہیل کا دوست ہونے کی وجہ سے وہ پولیس کی پکڑ میں نہ آ جائے۔" ان کا دل ایک بار پھر وسوسوں سے بھر گیا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تم خوامخواہ کے وہم نہ پالو۔" انہوں نے بیوی کو تو مطمئن کر دیا مگر خود گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"سیف!" وہ ماں کی پکار پر کمرے میں جاتے جاتے رک گیا۔

"کھانا کھایا بیٹا؟"

"نہیں اماں!"

"اچھا تم چلو اپنے کمرے میں، میں لے کر آتی ہوں۔"

وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ "میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں تم کہاں جا چھپی ہو عنیزہ! میں تیسری بار تمہارے علاقے سے ناکام لوٹا ہوں۔ ہجر بھی کالے پتوں کا سفر ہے جس میں گم ہوتا جا رہا ہوں، ٹوٹتا جا رہا ہوں کوئی آس کا تنکا بھی نہیں جس کے سہارے نکل سکوں ابھر سکوں۔ یہ کیسی مسافت کی ڈور تم نے میرے پاؤں میں باندھ دی ہے کہ سفر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا۔ کوئی منزل کا نشان نہیں کوئی مسافت کا اختتام نہیں۔ صرف گرد سفر ہے اور ہجر ہے جو جسم و جاں سے لپٹا۔ جدائی کا ساتھی بنا ہے۔" وہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو بار بار صاف کر رہا تھا۔

"سیف بیٹا! اٹھو کھانا کھا لو۔" وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ ملازم ٹرے اٹھائے ان کے ساتھ تھا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر نیم وا آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔

"سیف! اٹھو بیٹا!" وہ پلیٹ میں سالن نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

وہ اٹھ کر واش روم میں منہ دھونے چلا گیا۔ واپس آ کر کرسی پر بیٹھا۔

"اماں! آپ نے کھا لیا؟" اس نے نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! ہم نے کھا لیا۔ اب تم کھاؤ تو میں بھی جا کر سوؤں۔" وہ اس کے کھانا کھانے تک خاموشی سے بیٹھی رہیں۔ وہ کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ دھو کر واپس آیا تو انہوں نے بات چھیڑی۔

"سیف!"

"جی اماں!"

"بڑے دنوں سے پریشان لگتے ہو بیٹا! میں ماں ہوں تمہاری، سب سمجھتی ہوں۔ مگر تم کچھ بات نہیں کرتے، بتاتے نہیں آخر کیا بات ہے۔ جو بھی دل میں ہے وہ بتاؤ۔" وہ اس کی پیشانی چومتے افسردہ ہو گئیں۔

"اماں! آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، مائیں تو ہوتی ہی وہمی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

وہ چلی گئیں تو وہ سوچنے لگا۔

"بابا تو اس طرف جانا ہی پسند نہیں کرتے تھے کہ بیٹوں کی طرف بھی نہیں۔ وہ کیسے مان سکتے ہیں کہ بیٹی کی ذات کی اک لڑکی نے ان کے بیٹے سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ وہ کیسے میری مدد کر سکتے ہیں۔ اگر میں انہیں بتاؤں تو وہ تو ناراض ہو جائیں گے کہ میں ایک ایسی لڑکی کے پیچھے پاگل ہو رہا ہوں جس نے اپنا کوئی اتا پتا بھی نہیں چھوڑا ہے۔ بس ایک بار میں اسے ڈھونڈ نکالوں پھر ہر طرح سے بابا کو راضی کر لوں گا۔" اس نے پرعزم ہو کر سوچا۔ "مگر تم مجھے ملو تو عنیزہ!" اس نے بے بسی سے خود کلامی کی۔

"ایک بار پھر میڈم حمیدہ کی طرف جا کر دیکھوں۔ اب اتنے مہینے ہو گئے ہیں ہو سکتا ہے اب کی بار وہ بتا دے۔"

اور دوسرے ہی دن وہ میڈم حمیدہ کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ مجھے عنیزہ کا پتا دیں۔ میں آپ کو منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔"

"دیکھو سیف صاحب! میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ویسے بھی عنیزہ کا پتا میرے پاس صرف بدین ضلع لکھا ہوا ہے۔ پہلے ہی بڑی خواری ہوئی ہے میری۔ کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اب کوئی آدھی قیمت پر بھی گھر لینے تیار نہیں ہوتا۔ اوپر سے پولیس کی پوچھ گچھ۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی ہے میری۔ اگر آپ مجھے زیادہ تنگ کریں گے تو مجبوراً مجھے پولیس کی مدد لینا پڑے گی اور آپ کے لیے یہی شہادت ہی کافی ہے کہ سہیل آپ کا گہرا دوست تھا اور حادثے کے ٹائم آپ ہی اسے لے کر آئے تھے۔" وہ بغیر سانس لیے بولتی چلی گئی۔

وہ ایک بار پھر بے مراد لوٹا تھا۔

* * *

وہ دیکھ رہی تھی کہ صائمہ کافی دنوں سے کچھ پریشان لگ رہی ہے مگر وہ اسے کچھ بتانے سے بھی گریزاں تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس سے پریشانی کا سبب پوچھے مگر کئی بار وہ پوچھتے پوچھتے رک جاتی جب وہ مناسب سمجھے گی تو خود ہی بتا دے گی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو جاتی مگر اب وہ اس کو کچھ زیادہ ہی نوٹ کرنے لگی تھی حالانکہ یہ بات بھی اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ صائمہ بہت کم کلاسیں اٹینڈ کرتی۔ وہ اس پر بگڑی۔

"صائمہ! خدا کے لیے ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں اور تمہاری اتنی چھٹیاں۔ بہت حرج ہو رہا ہے پڑھائی کا۔"

وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر آنکھیں موند کر پڑی رہتی۔

"آخر تم کو ہو کیا گیا ہے؟" بالآخر اس نے اک دن پوچھ ہی لیا۔ "اب تم سہیل سے بھی کم ملنے لگی ہو کیا کوئی ناراضی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دے کر کروٹ بدل لی۔

"آج تم مجھے بتا ہی دو۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گئی۔ "میں انتظار کرتی رہی کہ شاید تم خود ہی بتا دو مگر تم تو اک لفظ بھی نہیں بولتی ہو۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ اسے صاف لگا کہ وہ اس کے اپنائیت بھرے انداز پر آنکھوں میں آئی نمی اپنے اندر اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"صائمہ!" اس نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ صائمہ نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

"تم جاؤ عنیزہ! ورنہ پوائنٹ نکل جائے گا۔"

اس وقت تو وہ خاموشی سے چلی گئی تھی مگر شام کو جب سیف اس سے ملنے آیا اور وہ خوشگوار کیفیت میں جانے کو مڑی تو اس نے اسے پکار کر کہا۔ "عنیزہ ملنے میں محتاط رہا کرو اور اتنی جلدی جلدی مت ملا کرو۔ غالباً تین دن پہلے ہی سیف آیا تھا۔"

وہ رک کر اس کی طرف مڑی۔ "یہ تم کہہ رہی ہو صائمہ!" وہ جھک کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"ہاں!" اس نے گھٹنوں پر رکھی کتاب کو افسردہ سی مسکان کے ساتھ بند کیا۔

"تم تو کہتی ہو انتہا محبت کو کہا جاتا ہے؟" اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں کہتی تھی۔" اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ مرد دریافت کا دعوے ہے عنیزہ! اگر وہ عورت کو مکمل دریافت کرلے تو پھر تکتا نہیں اور جاتا ہے۔ اسی لیے کچھ دروازے اس پر ہمیشہ بند رکھنے چاہئیں تاکہ کشش برقرار رہے۔ میری جان! من کے اگر سارے ہی بھید کھل جائیں تو پھر من اپنی حیثیت کھو دیتا ہے اور من بے حیثیت ہو جائے تو سکون گم ہو جاتا ہے۔ اسے تلاشتے تلاشتے ہم اپنا آپ کھو دیتے ہیں۔"

اس نے گہری گہری سانس لی۔ وہ چپکے سے اٹھی تو وہ پھر بول پڑی۔

"احتیاط! اپنی ذات کے کواڑ بند کر لو عنیزہ! اس لیے کہ مرد جیسا پنچھی ایسی زمین پر نہیں اترتا جہاں ہمیشہ وہ اترا رہا ہو۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس دن وہ سیف سے بھی پوچھ بیٹھی کہ سہیل نے آنا کیوں کم کر دیا ہے۔

"پتہ نہیں۔" وہ بھی لاعلم تھا۔

"تو آخر بات کیا ہے؟" وہ کتنے ہی دن پریشان رہی۔ صائمہ کا وہی طرز عمل، کبھی موڈ ہوتا تو اس کے ساتھ چلتی ورنہ پڑی رہتی منہ لپیٹے ایک ہی کمرے میں بند۔ اب تو بہت دنوں سے اس کی طبیعت بھی گری گری رہنے لگی تھی۔ وہ میڈیکل کی طالبہ تھی جو بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ نہ ہی ایسی بات سوچنا چاہتی تھی مگر اب اس کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

بہت دنوں بعد اس نے دیکھا کہ وہ سہیل سے ملنے گئی تھی۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس دن خلاف معمول وہ بہت جلد آگئی۔ آتے ہی بغیر چینج کیے بستر میں جا گھسی۔ یہ واضح اشارہ تھا نہ کچھ سننے نہ کچھ بولنے کا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے کچھ نہ پوچھ سکی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

آدھی رات کا وقت ہوگا جب اس کی آنکھ سسکیوں کی آواز پر کھلی۔ وہ سانس روکے اس کے رونے کو سنتی رہی پھر اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

"صائمہ!" اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"عنیزہ! عنیزہ! وہ کہتا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔" اس نے سسکتے ہوئے اس کی گود میں سر رکھا۔ "تمہیں کیا پتہ عنیزہ! میں پل پل جیتی اور مرتی رہی ہوں۔ وہ اب کہتا ہے کہ میں مجبور ہوں۔ جب، جب اک وجود میرے اندر پل رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ چلو میں تمہیں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

وہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے لگا اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی ہے۔ اس کا جو خوف تھا ہو چکا تھا۔ اگر صائمہ اس کی یہ حالت دیکھ لیتی تو یقیناً" وہ نا بند کر دیتی مگر اندھیرے میں ہی وہ اس کی گود میں سر رکھے روتی بلکتی رہی گئی۔

"کیوں برباد کیا اس نے مجھے۔ وہ خود مہینوں میرے پیچھے چلا تھا۔ تب جا کر میرا دل کہیں مائل ہوا تھا۔ اس نے میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ اب وہ مجھے پھانسی پر لٹکا کر خود بری ہو جانا چاہتا ہے۔"

اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی سسکیاں صائمہ کی سسکیوں سے مل گئیں۔

کتنے ہی کٹھن دن اور بے رحم راتیں گزر گئیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائی رہیں۔ تب اک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"اب تم کیا کرو گی صائمہ؟"

وہ کچھ دیر خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ "تم سیف کو کہو شاید وہ اسے راضی کر لے۔ تمہیں پتہ ہے عنیزہ! اب میں اپنے والدین کے پاس نہیں جا سکتی۔ اس لیے کہ اب میں ان کے لیے باعث شرمندگی بن چکی ہوں۔ وہ مجھے اس حالت میں قبول بھی نہیں کریں گے۔ وہ، وہ صرف مجھ سے نکاح کر لے پھر چاہے تو چھوڑ دے مجھے۔ تم سیف سے کہو وہ اس سے بات کر کے دیکھے۔"

اس نے بڑی دقت سے سیف کو یہ بات بتائی۔

"عنیزہ! وہ نہیں مانے گا۔ کہتا ہے میرے خاندان میں غیر خاندان سے عورت نہیں آتی۔ وہ وہ بچپن کا بیاہا ہے۔ اگر وہ صائمہ سے شادی کرلے گا تو اسے جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔"

"تو کیا تم سب کچھ جانتے تھے سیف؟" اس نے دھیمے سے کہا۔

"نہیں۔ پہلے مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ میں کبھی اس کے گاؤں نہیں گیا اور گھر کی باتیں بتانے کا رواج نہیں۔"

"تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا؟" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔

"اس نے مجھے خود بتایا ہے جب سے یہ حالات ہوئے ہیں۔ اب پھر بھی میں تمہارے کہنے پر اسے سمجھاؤں گا۔ وہ ملنے یہیں لے آؤں گا۔ تاکہ صائمہ اور وہ بیٹھ کر اس مسئلے کا حل نکالیں۔"

اس دن کے بعد صائمہ اس سے روز پوچھتی کہ کب سیف اسے لا رہا ہے۔ ابھی تک سیف نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ صائمہ تو پڑھائی چھوڑ چکی تھی۔ اس کی پڑھائی بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اب کبھی کبھار ہی جاتی۔ دونوں سر جوڑے آنے والے حالات سے نمٹنے کی حکمت عملی طے کرتی رہتیں۔

"اس سمسٹر کے بعد تم کہاں جاؤ گی؟" وہ پریشان ہو اٹھتی۔

وہ تلخی سے مسکرا کر کہتی۔ "جہاں اللہ لے جائے گا۔" وہ اس کی مبہم بات سمجھ ہی نہ پاتی۔

پھر اک شام سیف سہیل کو گھیر کر لے ہی آیا۔ وہ وہاں اک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔

"میں مجبور ہوں۔" سہیل نے جھجکتے ہوئے شروعات کی۔

"مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا سہیل مزاری!" صائمہ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

"ہم کسی ڈاکٹر کے پاس چلیں تو بہتر ہے بجائے یہاں فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کے۔"

صائمہ نے اپنے وجود کو ذلت کی گہرائیوں میں لٹتے ہوئے محسوس کیا۔

"خرچا سارا میں اٹھاؤں گی۔ اس کی تم لوگ فکر نہ کرو۔"

عنیزہ نے نفرت سے اسے دیکھا۔ "اور صرف نکاح کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"نہیں عنیزہ! میری برادری کا مسئلہ ہے۔ میں پہلے ہی اپنی برادری کے سردار کی لڑکی سے شادی کر چکا ہوں۔ اگر میرے خاندان والوں کو میرے نکاح کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ مجھے برادری سے، جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ وہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی کہ تم شادی شدہ ہو۔ کیوں پڑے تھے تم میرے پیچھے؟" وہ چلائی۔

"مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی صائمہ!"

"نہیں۔ تم نے مجھے صرف شکار کیا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ تم چلو میں تمہیں اسپتال لے چلوں۔"

"جھوٹ مت بولو تم۔ مت دو ہوس کو محبت کا نام۔" وہ اس پر جھپٹی۔

"چھوڑ دو میرا گریبان!" سہیل نے اسے دھکا دیا۔ وہ سنبھل کر پھر اس پر جھپٹی۔ "میں تمہیں چھوڑوں گی۔ یہ سمجھ لیا تم نے ابھی صرف عورت کی محبت دیکھی ہے انتقام کب دیکھا ہے تم نے۔ یہ" اس نے اپنے پیٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ تمہارے خلاف سب سے بڑی شہادت ہے کہ تم نے جبر کیا ہے۔ میں تمہیں پھانسی کے پھندے پر لٹکواؤں گی۔" اس پر جنون سوار ہو چکا تھا۔

عنیزہ منہ پر ہاتھ رکھے بے آواز روتے ہوئے دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے صائمہ کا وحشت زدہ روپ دیکھتی اور بے تحاشا روتی جاتی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ ارے پاگل تو نہیں ہو گئے۔" سیف ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ان کی چیخوں پر میڈم حمیدہ کمرے میں چلی آئی تھی۔

سہیل بار بار خود کو چھڑاتا اور اس کو دھکا دے کر

بچانے کی کوشش کر کے وہ لڑکھڑا کر جھانکی اور وہ ڈر اس کی طرف گئی۔

"تمہیں زندہ چھوڑ کر اب کہاں جا سکتے ہو۔" عنیزہ وہاں کو حیرت سے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ جواب چھڑانے کی کوشش میں اک دوسرے کو مار رہے تھے۔

سہیل بھاگ کر باہر گاڑی تک آیا۔ صائمہ بھی اور عنیزہ اس کے پیچھے بھاگی۔

"ہم تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" وہ گاڑی کے سامنے آئی۔ عنیزہ اس کے پیچھے بھاگی باہر ہاسٹل کی لڑکیاں حیرت و استعجاب سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اک دو نے اس سے پوچھنے کی بھی کوشش کی مگر وہ تیزی سے باہر نکلی۔ گاڑی آگے بڑھ چکی تھی اور اس کے پہیوں کے نیچے کچلا ہوا وہ خون میں لت پت پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس سے پہلے سیف پہنچا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ سیف نے چوکیدار کی مدد سے اٹھا کر اسے اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ عنیزہ سیٹ پر اب دونوں ہاتھوں سے سنبھالے بیٹھ رہی تھی۔

"سیف جلدی کرو۔"

صائمہ کی سانسیں اکھڑتی جا رہی تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھیں ایک ہی جگہ منجمد ہو چکی تھیں اور اس سے عنیزہ عارف نے اپنا سارا اختیار، اعتبار ان آنکھوں میں ہی کہیں کھو دیا۔

"رک جاؤ سیف!" وہ چلا کر رونے لگی۔ "اب کسی ہاسپٹل جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" آہستہ آہستہ گاڑی واپس آ کر ہاسٹل کے دروازے پر رکی۔ موت اس کی جان لے بیٹھی۔ کمائی اس کے بچے مسکراتے وجود کو۔

ان کے بیچ اس کا بے جان وجود رکھا تھا۔ لڑکیاں پرنسپل عنیزہ سے حالات جاننے کی کوشش میں لگی تھیں۔ بچہ اس کو دیکھ رہی تھیں۔ تو کچھ پوچھ رہی تھیں۔ "لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ اور زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس لاش اٹھوا کر لے گئی۔

"یہ خودکشی کا کیس ہے۔ لڑکی خود نکلی تھی۔ گاڑی کے سامنے۔" کارروائی وہیں مکمل ہو چکی تھی۔

اس کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ وہ ساری رات اپنے کمرے میں تڑپتی رہی خود کو کوستی رہی۔ کبھی سہیل کو بلوایا۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی اس کی ڈائریاں کی ورق گردانی جن میں لکھا ہوا ہر لفظ سہیل کی محبت میں گندھا ہوا تھا۔ روتے روتے آنکھوں کا کاجل بہہ گیا تھا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ اک سناٹے کا عالم طاری تھا۔

صبح اس نے اپنے گاؤں کے قریبی شہر اپنے کسی رشتے دار کو فون کر کے کہا کہ بابا بھائی آ کر اسے لے جائیں۔ فون کر کے وہ بیٹھی ہی تھی کہ صائمہ کے بھائی آ گئے۔ اس سے حالات جاننے کے خواہاں۔ ان کے چہرے غصے سے تپے ہوئے، آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہوئے تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر بے ساختہ رونے لگی۔

صائمہ اکثر رو کر کہتی تھی۔

"عنیزہ! تمہیں کیا پتا کہ میں اپنے بھائیوں، ماں تو زندہ۔"

اور پھر اس نے کچھ نہیں چھپایا، جو جانتی تھی وہ انہیں بتا دیا۔ اسے سہیل سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ نفرت کا شدید احساس تھا اور کچھ نہیں۔ اس نے چند خطوط اور اک ڈائری کے علاوہ سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔ "یہ ڈائریاں آپ کو ساری کہانی بتا دیں گی۔"

"پولیس کا منہ تو پیسوں سے بند کر کے تفتیش سے روک دیا گیا، تمہیں اب میڈم [illegible] ان سے کیسے بچے گی۔"

اس نے سوچا، ان کے جانے کے بعد اس نے پیکنگ کی اور سیف کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا رات تک اسے بھائی لینے آ جائیں گے اب یہاں اک پل بھی رکنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔

اور جب سیف مصطفیٰ اس سے ملنے آیا تو وہ روتے ہوئے کھول کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔ اس کا خوف اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔

اسے خوف زدہ دیکھ کر عنیزہ عارف اس سے خوف زدہ تھی۔ کیا وہ مجھے بھی دنیا کے ان مردوں کے ساتھ کھڑا کرے گی جو پرندوں کو نہیں تتلیوں کو شکار کرتے ہیں۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا جب اس نے کہا۔

"تم بھی مردوں کے معاشرے کے اک مرد ہو۔ تمہارے اور میرے راستے الگ ہو چکے ہیں۔"

وہ کچھ کر رہی تھی، مہلا سیف کی محبت سے دستبردار ہو گئی۔ یقین تھا کہ وہ سچی محبت تو شاید ہار جائے۔ اس نے اس کی کوئی بات نہیں سنی اور رات ہونے سے پہلے وہ ہاسٹل چھوڑ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

* *

ایک سال گزر گیا۔ سیف کی توجہ دن بدن پڑھائی سے ہٹتی چلی گئی۔ وہ سارا سارا دن کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں کئی بار رئیس غلام مصطفیٰ اس کے کمرے کی تلاشی لے چکے تھے۔ مگر کوئی بھی قابل اعتراض چیز نہیں ملی تھی۔ جس سے وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہوں۔ سوچتے ہوئے سیف کے کمرے میں آ گئے۔

"آج اس سے سب کچھ اگلوا کر رہوں گا۔ پیار، غصہ سب آزماؤں گا۔ کیا پتا شاید وہ سچ بتا دے۔"

وہ کمرے میں نہیں تھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے بیڈ پر والٹ پڑا تھا۔ انہوں نے یوں ہی بے ارادہ اٹھا کر کھولا تو اس میں ہنستی ہوئی لڑکی کی تصویر پر نظر پڑی، وہ حیرت سے دیکھنے لگے۔

"یہ تو وہی ہے! بالکل ہو بہو اپنی ماں کا عکس۔" وہ ایک نظر میں اسے پہچان گئے تھے۔

* * *

عجیب بات تھی۔ وہ اچانک اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ بچپن سے ان کے گھر میں رہتی آئی تھی اور اس کی زیادہ بچی بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کرب زدہ ماں کی دہلیز پر وہ اسے اچھی لگنے لگی تو اس نے چپکے سے یہ بات ماں کو بتا دی۔ مگر وہ اس کی طرف مائل نہیں تھی۔ اس کی ماں کی ہوئی جو نواب صاحب کی لاڈلی ہوئی کیسے۔ تو اس کو بچپن سے ہی اس کو شوق تھا۔ پھر اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اور ادا عارف اک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، پہلے پہل تو اسے فخر کیا کہ اس نے خود کو سمجھایا۔

اک دن جب وہ کالج سے آیا تو عائشہ سے ملنے گھر پہنچا ہے۔ وہ حیران رہ گیا لیکن اس کا بھائی پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ سمجھ گیا کہ انہی کے بچوں کی آپس کی بول چال، رسم و رواج کے مطابق بند تھی مگر اب اس کا بھائی بھی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ دونوں بھائیوں کے بیچ عجیب کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔

لیکن اس کے امتحان کے دنوں میں عارف جیسے لے کر شکار پر چلا گیا۔ اسے بے تحاشا غصہ آیا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن گیا اور پھر جب شہر پہنچ کر کالج تک آیا تو پرچہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کے کلاس پہنچنے کی کوشش کے باوجود اسے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا تھا۔ پھر امتحان ختم ہونے تک شہر میں ہی رہا۔ البتہ اسلامیات کے آسان پرچے میں اس کی سپلی لگ چکی تھی۔

کچھ ہی عرصے بعد اس نے باپ سے کہہ دیا کہ وہ نوکری کرنا چاہتا ہے۔

"یہ زمینیں کون سنبھالے گا؟" اس کے باپ نے حیرت سے کہا۔

"مجھ سے نہیں ہوتی یہ زمینداری۔ ادا عارف دیکھ لے گا زمینوں کو۔"

"رئیس! اگر نوکری کرنا چاہتا ہے تو کرنے دے، چار دن کا شوق ہے، ملازمت کرنا پڑے گی تو خود ہی چھوڑ کر بھاگ آئے گا۔"

اس کی ماں کے کہنے پر اس کے باپ نے اپنے کسی دوست سے کہلوا کر اسے بینک میں ملازمت دلوا دی۔ وہ اس جاب کے سلسلے میں گاؤں سے باہر رہنے لگا تھا۔ جب اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں تو اسے گاؤں بلوا لیا گیا۔

"ساری عمر لوگوں کو دینے میں گزری ہے۔ اب

پینے کی باری آئی ہے۔" اس کا باپ خوش ہو رہا تھا۔

سردی کی راتیں گاؤں میں تو زیادہ ہی لمبی ہو جاتی ہیں۔ اس نے ٹارچ اٹھا کر گھڑی دیکھی۔ ابھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ باہر چاندنی تھی۔ سو اس نے ٹارچ نہیں لی۔ وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ کسی کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں آواز کی سمت بڑھا۔

"تم مجھے زہر لا دو میں کھا کر مر جاؤں پر اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میرا دل اسے قبول نہیں کرتا۔"

"نہیں عائشہ! زہر کھائیں گے تو دونوں کھائیں گے پر میرے پاس ایک اور راستہ بھی ہے۔ ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔ میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ ہمیں کہیں بھی چل کر رہنے میں تکلیف نہیں ہوگی۔"

"پر عارف اگر ہم پکڑے گئے تو نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔ اس سے بہتر ہے تم زہر ہی لا دو۔"

"نہیں، نہیں عائشہ! ہم جیپ میں جائیں گے۔ تمہیں پتا تو ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہمارے پاس ہی گاڑی ہے۔ لوگ جب تک گھوڑوں پر شہر پہنچیں گے وہاں سے کوئی گاڑی لے لیں گے تب ہم ان کی پہنچ سے دور چلے جائیں گے۔ میرے چند دوست ہیں جو ہمیں پناہ دے سکتے ہیں۔ تو پریشان نہ ہو۔ ہم ایک دوسرے کے بنا جی ہی نہیں سکتے۔"

آگے سننے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔ ان کے دونوں کے فیصلے خاندان کے لیے باعث ذلت ہوتے۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی۔

دوسرے دن اس نے شہر جانے کے بہانے عارف سے جیپ کی چابی لے لی تھی۔ شام کو جب وہ آیا تو عارف نے اس سے چابی مانگی۔

"کیوں؟ تم اس وقت کہیں جا رہے ہو؟" اس نے ترشی سے پوچھا۔

"نہیں، صبح سویرے مجھے کھاد لینے جانا ہے۔ تم دیر سے اٹھتے ہو اس لیے ابھی دے دو۔"

"مجھے قریبی گاؤں میں کچھ کام ہے۔ میں رات کو وہاں جاؤں گا۔ دیر سے لوٹوں گا۔ تم صبح جب جاؤ گے اٹھا کر چابی لے لینا۔"

وہ بہانا بنا کر جیپ لے گیا۔ گاؤں کے باہر اس نے جیپ کھڑی کر دی اور خود اس مسئلے کا حل سوچنے لگا۔

"اگر میں ابا کو بتا دوں تو بھی انہیں صرف بھاگنے سے روک سکتا ہوں، خودکشی سے تو نہیں۔ یہی ذلت ہو گی جب وہ لاشیں اٹھیں گی۔ لاکھ بھائی بڑا سہی پر اس کی موت تو مجھے قبول نہیں اور عائشہ وہ کیوں بے گناہ مرے۔ اور یہی ذلت ہو گی جب وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔

بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر آدھی رات کو گھر لوٹ آیا۔ عارف جاگ رہا تھا۔

"میں نے سوچا صبح تمہاری نیند خراب کروں گا اس لیے تم سے چابیاں لینے کے لیے جاگ رہا۔" عارف بھی ہنستے ہوئے بولا۔

اس نے چابی جیب سے نکال کر اس کو تھمائی۔

"لالا! دو راہیں تم نے سوچی ہیں ان دونوں پر بھی ذلت ہے اور جو راستہ میں نے نکالا ہے اس پر بھی ذلت ہے۔ جب تینوں راستوں پر ذلت کھڑی ہو تو عقلمندی کا تقاضا ہے کہ اس راستے پر چلا جائے جس پر ذلت کم سے کم ہو۔ جب اس گاؤں میں کل کا سورج ابھرے تو اس کی کرنیں تمہارے لیے اس گاؤں میں ہی پڑنی چاہئیں۔"

عارف خوف زدہ ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔

وہ ساری رات اپنے بستر پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا تھا۔ کمرے کے دوسرے کونے پر رکھی چارپائی پر عارف سونے کی ناکام اداکاری کر رہا تھا۔ اس کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں اس کے ماں باپ کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ دوسرے کمرے کے ساتھ جو کمرہ تھا اس میں ناہید اور عائشہ سو رہی تھیں۔

وہ بار بار ٹارچ جلاتا اور گھڑی دیکھتا۔ بجلی ابھی اس کے گاؤں کو نہیں ملی تھی۔

مرغوں نے اذانیں دینی شروع کر دی تھیں۔ وہ کچھ اونگھ سا گیا۔ اس کے باپ کی کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تہجد کے لیے اٹھ چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب اماں اٹھے گی اور اٹھ کر گرم پانی سے ابا کو وضو کروائے گی۔ اب ہو سکتا تھا۔ سو بے سدھ ہو کر سو گیا۔

دوسرے دن اس کے شادی سے انکار پر ٹھیک کہرام مچ گیا تھا۔

"اس کو حیا شرم نہیں، جب تاریخ طے ہو گئی ہے تب کہتا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ جب منگنی ہوئی تھی تب انکار کرتا۔ میری یتیم بھتیجی میں اس کے پلے باندھتا ہی کیوں۔ اب لوگ تھو تھو کریں گے مجھ پر۔ میری پگڑی پاؤں میں ڈالنے کی بات کرتا ہے۔ تم سن لو غلام مصطفیٰ! تمہاری شادی ہو گی تو عائشہ سے ہو گی۔" اس کا باپ گرجا۔

باپ کی اسی ضدی طبیعت کی وجہ سے تو اس نے حقیقت نہیں بتائی تھی۔ وہ ہر صورت اس کی شادی عائشہ سے کروائے گا۔ اس نے سوچتے ہوئے باپ کو دیکھا۔

"میں شہری لڑکی سے شادی کروں گا۔ آپ عائشہ کی شادی لالا عارف سے کر دیں۔" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"بس زیادہ فیصلے نہ کر۔ میں نے کہہ دیا کہ تمہاری شادی طے ہے اور ہو کر رہے گی۔"

"میں بھی آپ کا بیٹا ہوں ابا! جب طے کر چکا ہوں کہ میں عائشہ سے شادی نہیں کروں گا تو پھر کسی قیمت پر آپ کا فیصلہ نہیں مانوں گا۔"

"سن اب اپنے بیٹے کی بات۔ میرا فیصلہ نہیں تھا۔ یہ تو نے ہی بتایا تھا کہ یہ کہتا ہے عائشہ سے شادی کرے گا۔"

"مجھے کیا پتا رحیم! اس نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا۔" وہ شوہر کے آگے کانپ رہی تھی۔

"وہ چند سال پہلے کی بات تھی۔"

"کیا کہتا ہے نامراد! چند سال پہلے کی بات تھی۔ بول یہ شادی بیاہ کوئی نئی بات ہے۔" وہ چپ رہا۔

"میں یہ شادی کسی صورت نہیں کروں گا۔"

"میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا غلام مصطفیٰ!"

"مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"سچ کہا تھا کسی شاعر نے

[illegible] چھوڑیں کہیں جوان
[illegible] بھی انسان [illegible]

(ایک تو دوسری زمین چھوڑتے نہیں جوان بہادر لوگ، وہ بھی انسان جو تنگ دامنوں پر شمار ہو جاتے ہیں۔)

اس کے باپ نے [illegible] مثال دی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ سب کچھ اسی وقت باپ کو بتا دے کہ وہ عزت پر ہی تو سب کچھ قربان کرنے جا رہا ہے مگر عارف کی التجا بھری نگاہ اسے کچھ بھی بتانے سے روک رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ گاؤں چھوڑ دے گا تو عائشہ کی شادی عارف سے ہی ہو گی اور ایسا ہی ہوا۔

اور اب اتنے سالوں بعد وہ کیسے جا کر اسی بھائی کے آگے دست سوال دراز کرتا۔

"تم اس لڑکی کے لیے پریشان تھے نا۔" سیف باہر نکلا تو اس نے پوچھا۔ سیف نے نظریں جھکائیں۔ "میں اسے جانتا ہوں۔"

اس نے سر اٹھا کر حیرت سے باپ کو دیکھا۔

"یہ رمیں عارف کی بیٹی ہے نا؟" اس نے تصویر والا ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"جی پاپا! آپ کو پتا ہے اس کے گاؤں کا؟" ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

اس نے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی نمی کو دیکھا اس کا دل شفقت سے بھر گیا۔

"ہاں، یہ تمہارے چاچا کی بیٹی ہے۔"

* * *

"دیکھو ایک سال ہونے کو آیا پر یہ سنبھلی نہیں۔

وہ واقعہ اس کے ذہن و دل پر چھا گیا ایسا کہ کئی دنوں تک وہ کھل کر بول نہ سکا۔ علاج کروایا لوگوں نے پڑھیں کو اتفاق نہیں ہوا۔ کہیں آتی جاتی بھی نہیں۔ پڑھائی بیچ میں چھوڑ دی۔ بات کریں تو جواب دیتی ہے ورنہ خود سے بات بھی نہیں کرے گی۔ دیکھو کیسے چہکتی تھی میری بچی اس چپ لگ گئی ہے اسے۔"

وہ آبدیدہ ہو کر اپنی رشتے دار عورتوں کو بتا رہی تھیں۔

"ہائے بے چاری! جوان جہان لڑکی ہے۔ حسد کر گئی لوگوں کی آنکھ جو لگ گئی ہوگی۔ کوئی دم درود کرواؤ۔"

"اپنی لاڈلی کو دعائیں بھی پڑھی کرواتی ہیں۔ پر یہ تو سارا دن اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی ہے۔ ہاں کتابیں رٹتی ہے بھائی کو ہم کہہ کر اسے کچھ لے آؤ۔ اس کا باپ کہتا ہے اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ وقت گزرنے کے بعد صدمے کی کیفیت سے نکل آئے گی۔"

اسے غصہ آ جاتا اماں ہر آنے والے کے آگے یہی دکھڑے لے بیٹھتی تھیں کہ اس کی بچی زندگی کے ہنگاموں میں حصہ نہیں لیتی اور وہ کیا بتاتی اماں کو کہ جن کی زندگی ہی محبت ہو اور وہ چھن جائے تو پھر زندگی ہی بے سود ہے۔

کتنی راتیں گزر گئیں۔ جو اس کا ہجر اوڑھے آنکھوں میں کٹیں۔ کتنے ہی فراق کے سورج ابھرے اور جدائی کو مستقل کر گئے۔ وہ اک اک سانس کا حساب کرتی رہی جب اس کی یاد نہ آئی ہو۔ اک لمحہ اک پل اک ساعت بھی ایسی نہیں گزری۔ جب اس کے خیال نے ساتھ چھوڑا ہو۔ وہ تو ہمیشہ دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ کتنا چاہا تھا اس نے کہ وہ اس کی یاد سے دامن چھڑا لے اس کے خیال کو روند ڈالے پر وہ تو زندگی کی رمق بن کر اس کے دل کو دھڑکاتا رہا۔

اور عنیزہ عارف کی آنکھیں خشک ہونے کو ترس گئیں۔

اس کی نیندیں اس سے روٹھی رہیں اس سے بچھڑ کر پھر سکون میسر نہ ہو سکا۔ وہ بے مراد لمحوں میں جیتی رہی۔ محبت کے لمحوں میں جینے والوں کا ایک عالم یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ترازو میں ان کے دکھ سکھ، خوشی و غمی کے پلڑے ہمیشہ برابر رہتے ہیں۔ محبت انہیں روحانی خوشی دیتی ہے تو قلبی درد بھی۔ خوش نصیبی اور بدنصیبی ان کے پلو میں ساتھ ساتھ بندھی ہوتی ہے۔

سب اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔ اس کی زبان کھل کے نہیں رکی۔ وہ کیا بتاتی؟ ایک مرد کے اندھے فیصلے نے اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کر دیا اور اس نے خوف زدہ ہو کر عجلت میں اس سے بچھڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر وہ تو اپنی ذات سے ہی بچھڑ گئی۔ اپنے آپ سے ہی روٹھ گئی۔ اس کی منتظر مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اور اس کی دھڑکنیں جو ہر آنے والے کے قدموں کی چاپ سے بے چین ہو جاتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ معمول پر آگئیں۔

وہ اگر اپنی محبت میں واقعی سچا ہوتا تو ضرور لوٹ کر آتا۔ مگر سیف مصطفیٰ تم بھی تو فیصلے کا ہر جائی نکلے جس نے تمہیں چھوڑا تھا تو عورت کے ازلی خوف سے ڈر کر۔ اس خوف سے جو اس کے پیدا ہوتے ہی لوری کی صورت اسے سنایا جاتا ہے۔ دعاؤں کی صورت اسے بتایا جاتا ہے۔ اس کی آبرو کی حفاظت کی دعائیں لبوں پر ہر وقت مچلتی رہتی ہیں تو وہ دعا اس کے اندر یوں گڑ جاتی ہے کہ اسے خود سے بھی خوف زدہ کر دیتی ہے۔

اس کے باپ نے بستر پکڑ لیا۔ وہ پڑھائی چھوڑ بیٹھی۔ فیروزہ اسے روزانہ یونیورسٹی لے جانے کی مگر وہ کسی قیمت پر پڑھائی جاری رکھنے پر تیار نہ ہوئی۔ وہ کیسے اس کے ساتھ پڑھ سکتی تھی۔ اس کا اعتبار کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ سیف کو پتا تھا کہ سہیل شادی شدہ ہے وہ صائمہ سے فلرٹ کر رہا ہے۔ تو وہ کم از کم اسے بتا دیتا پھر تو شاید صائمہ اس کی محبت میں اتنا آگے نہ بڑھتی۔ مگر اس نے جان بوجھ کر یہ بات چھپائی۔ وہ مرد ہے اس نے ایک مرد کو عورت کا شکار کرنے کی اجازت دے دی۔ تو میں کیسے اس پر اعتبار کرلوں اس نے میرے اعتماد کو خود اپنے پاؤں تلے روندا ہے۔ وہ جب بھی ہوتی پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اس کا تکیہ ہمیشہ اس کے آنسوؤں کی لڑیوں سے گیلا ہوتا۔

مگر وہ دل سے نکلتا کیوں نہیں۔ لاکھ اسے جھٹلاؤں مجھے اس پر اعتماد نہ کروں۔ وہ میرے لہو میں دوڑتا ہے پاش پاش کر۔

اس بار خاندان کی شادی میں جب پھپھو ناہید کی بیٹی نے اسے کہا "چلو لاؤنج دیکھنے چلیں" تو اس نے اداس مسکراہٹ سے کہا۔

"مجھے اپنا بر ڈھونڈنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے خاندان کے لڑکے بھی اس رسم پر جمع ہوتے ہیں۔ لڑکی پسند آنے پر جھٹ رشتہ بھیج دیتے ہیں۔"

وہ اس کی باتوں پر ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔

"ہائے ہائے ماشاء اللہ! کسی نے تیری بچی پر تعویذ تو نہیں کر دیے۔" پھپھو ناہید کی اکلوتی نند نے نیا شوشہ چھوڑا تھا۔

وہ خیالات کی دنیا سے واپس آئی۔ صحن میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلتے ہوئے برآمدے میں دیکھا جہاں تخت پر بیٹھی رشتے دار عورتیں اماں کو نئی نئی پٹیاں پڑھا رہی تھیں۔

"محبت سے بھی بڑا کوئی تعویذ ہے بھلا۔" وہ دکھ سے مسکرائی۔

"ہاں اوئی ہاں! کسی نے کالا جادو تو نہیں کر دیا۔ اللہ مارے ان موئے بنگالیوں اور بھوپوں کو۔ ظلم کر دیا ہے انہوں نے۔" دوسری عورت نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"محبت کا اتنا بھیانک روپ دکھاتی ہے کہ جس کے آگے کالا جادو بھی کچھ نہیں۔" وہ تلخی سے سوچنے لگی۔

"ہائے اوئی اس طرف تو میرا خیال ہی نہیں گیا۔ بھلا میری تو کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔" وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"ہائے اوئی دشمنی کا کیا کہتی ہو یہاں تو لوگ خوا مخواہ ملنے (سبز خوشحال) کو سے نہیں دیکھنا پسند نہیں کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"اب اماں ان کی باتوں میں آ کر جانے مجھے کہاں کہاں گھسیٹتی پھریں گی۔" یہ سوچ کر وہ بے کل ہو رہی تھی۔ یہ تائید بھی کہیں بھی مطمئن نہیں ہو سکی۔

* * *

انہیں گاؤں میں آئے تئیس سال ہو چکے تھے جب وہ آخری بار اماں کی وفات پر آئے تھے۔ خان محمد حالیہ راستوں سے واقف تھا۔ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹ پر مریم اور سیف امید و بیم کی کیفیت میں گھرے بیٹھے تھے۔ سالوں کے ٹوٹے رابطے بحال ہوں گے یا نہیں؟ شکوک کتنی بار سے ان کے درمیان بیٹھے تھے۔ کھیت اور جنگل بدل چکے تھے۔ گاؤں کی روایتیں اور اسکول بھی ان کو نظر آیا تھا۔

وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ رئیس عارف نے حیرت سے غلام مصطفیٰ کو آتے دیکھا۔

"تم… تم غلام مصطفیٰ؟" وہ آگے بڑھے تو وہ بھی بڑھ کر ان کے گلے لگ گئے۔

"بھائی… بھلی کرے آئیں۔" وہ آبدیدہ ہو گئے۔ چھوٹے بھائی کے لیے دل میں سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی انہیں گلے لگائے ان کی پشت پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

دونوں بھائی اب عمر کے اس دور میں ماضی کی سب تلخیاں بھلا چکے تھے۔

"یہ میرا بیٹا ہے میرا سیف۔"

رئیس عارف نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے اسے گلے لگایا۔

"تیرا بیٹا ہے تو میرا بھی بیٹا ہے۔"

"ہاں بیا بالکل ٹھیک بات کی آپ نے۔" وہ ہنسے۔

"آجاؤ۔ بھا جائی۔ آجاؤ اندر آ کر بیٹھو۔ ہم خوشی میں باہر ہی کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔"

"ذرا جاڑے کی دھوپ بھی گرم نہیں لگتی۔"

"ہاں کہتے تو ٹھیک ہو غلام مصطفیٰ!"

ہاں عنیزہ نے دل کے ساتھ چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ عنیزہ نے سنا۔

"بھائی جان! آپ بھی۔" مریم نے صبر سے کہا۔ "بیٹا! بچوں سے بولو۔"

"عنیزہ تو تمہارے ہی گھر کی ہے۔ عنیزہ کو یاد آتی ہو۔"

"عنیزہ! تم بچپن میں پیارا بولتی تھیں۔" عنیزہ کو۔

عنیزہ رئیس عارف پر ترچھے تیں بیٹھے بیٹھے تو اس کی

"عنیزہ بیٹا! تم مجھ کو پہچانا ہے۔" عنیزہ نے سیف کو دیکھ کر ایک لمحے کو سوچا۔ دل کی دھڑکن رک سی گئی۔

سیف اسے دیکھ رہا تھا جیسی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ سے تو بچی کو دیکھا تو اب۔ پھر سیف کو ہاتھ سے... آنکھیں عنیزہ پر مرکوز تھیں۔ مریم ہنس رہی تھی۔

"تم ہی ہماری بچی!" غلام مصطفیٰ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹا یہ تمہارے چچا جان ہیں اور یہ ان کا بیٹا سیف۔" وہ قدرت کی مہربانی پر خوشی و حیرت کے ملے جلے جذبات سے ان کو دیکھتی رہی۔

"عنیزہ تم نے تو بڑی بابت کو لینے بھیجوں، پھر یاد کرتی ہے تمہیں۔"

"اب ہم خود چلیں گے سب مل کر ان کے ہاں، ہم دونوں کو اکٹھے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوں گی ذرا سوچیں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" رئیس عارف نے آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لیے چائے کے بہانے اٹھ گئی۔ سیف کی نظروں نے باورچی خانے تک اس کا پیچھا کیا۔

"چائے بنانے میں ہمارا بیٹا بھی ماہر ہے۔ اس کے باپ کو تو میرے ہاتھ سے زیادہ اس کے ہاتھ کی چائے پسند آتی ہے۔" سیف! تم جاؤ چائے بنانے میں عنیزہ کی مدد کرو۔" مریم نے اس کی مشکل حل کی۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر آیا۔ عنیزہ کی پشت تھی اس کی جانب۔

لوگ کہتے ہیں عشق کا روگ
زندگی سے عاری ہے
پھر بھی بے باہر جذبہ دل
عقل کے فلسفوں پہ بھاری ہے
آپ کو اپنی بات کیا سمجھاؤں
روز بجھتے ہیں حوصلوں کے کنول
روز کی الجھنوں سے ٹکرا کر
ٹوٹ جاتے ہیں دل کے شیش محل
لیکن آپس کی تند و تیز باتوں پہ
سوچتے ہیں خفا نہیں ہوتے
آپ کی صنف میں بھی ہے یہ بات
ہم ہی بے وفا نہیں ہوتے

وہ اس کی پشت پر کھڑا گنگنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی نمی کو وہ راستہ مل گیا۔

"آخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا ناں بے وفا لڑکی!"

بچھڑا ہو تو وجود میرا لخت لخت تھا
تو میری زندگی بھی تھا تو میرا بخت تھا

اس نے ہاتھوں کی پشت سے مسکرا کر آنسو پونچھے۔

"ہوتا ہے بے وقوف لیلاں کی طرح۔"

"جی نہیں وفادار ماروی کی طرح۔"

"تو بھی لیلاں کی طرح۔ تو بھی ماروی کی طرح۔"

وہ دونوں ہنس پڑے۔

اور باہر رئیس غلام مصطفیٰ نے بڑی آس سے اپنی جھولی بھائی کے آگے پھیلا دی تھی۔ اور رئیس عارف جو اس کے مقروض تھے کیسے انکار کرتے۔

"عنیزہ تمہاری ہی بیٹی ہے غلام مصطفیٰ!"

انہیں آتے دیکھ کر بات بیچ میں ہی چھوڑ دی۔

"بھئی۔ بڑی دیر کر دی چائے لے کر آتے میں۔ تم لوگوں کو تو تمہیں معلوم (الموج) زیادہ دیر چائے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ سب ہنس پڑے۔

"چچا جان! ہم نے اسپیشل چائے بنائی ہے اس لیے دیر ہو گئی۔" سیف چہکا۔

"ابھی پتا چل جائے گا چکھنے کے بعد۔"

"میں نے پہلے کہا تھا بابا آپ کو چائے اچھی نہ لگے اور آپ ہمیں ڈانٹیں۔ میں تو چلی گلاب کو پانی دینے۔" وہ اٹھ کر صحن کے کونے میں گلاب کے پودوں کو پانی دینے گئی۔

"ارے سیف! تم یہاں کیا کر رہے ہو ذرا جاؤ ہماری بچی کا ہاتھ بٹاؤ اور ہاں اس سے یہ ضرور پوچھنا کہ پھولوں کو پانی کیوں دیتی ہو؟" وہ باپ کے کہنے پر خوش دلی سے اٹھ گیا۔

"غلام مصطفیٰ اب تو کوئی پریشانی اسے نہیں ہو گی۔ جزا اس کا اپنا گھر ہو گا۔"

"ہاں صحیح ہے اور اپنے گھر میں بھلا کون ڈرتا ہے۔"

"گلشن اور لگاوٹ میں فرق ہوتا ہے۔ پاگل لڑکی! گلشن لگ جاتی ہے اور لگاوٹ لگانی پڑتی ہے۔"

وہ گلابوں کو پانی دے رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"گلشن چھوٹی نہیں، لگاوٹ قائم نہیں رہتی۔ گلشن من سے وابستہ ہوتی ہے اور لگاوٹ تن سے۔ گلشن اندر ہی اندر سلگاتی رہتی ہے۔ لگاوٹ چنگاری کی طرح جل کر بجھ جاتی ہے۔"

وہ پلٹا مڑے مسکرا کر آگے بڑھتی رہی۔

"گلشن بندے کے اندر درختوں کی طرح جڑیں پکڑتی ہے اور لگاوٹ ٹہنیوں کی مانند خشک ہو کر سوکھ جاتی ہے۔ گلشن باطنی جذبہ ہے اور لگاوٹ ظاہری جذبہ۔"

"بس بس کافی ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر جھنجھلاتے ہوئے اسے روکا۔ سیف نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھور کر اسے مصنوعی ناراضی سے دیکھا۔

"کیا یقین اور گلشن اور لگاوٹ کے فرق کا بھی پتہ چل گیا۔"

"ارے ہاں میں تمہارا وہ سوٹ لایا ہوں جو تم نے کہا تھا کہ جب ہاں کو دیکھ کر دوں گا تو مجھ کو دے کر سلیمہ خفگی سے پوچھی کیا لگتی ہو؟"

اسے گھور کر مصنوعی خفگی سے۔

"دیکھو تم سے تو غلام مصطفیٰ کا کیا ہو گا۔"

رئیس عارف نے دور سے بچی کو پوچھا۔ مسکراہٹ بہت قریب تھی۔ دھوپ کی تمازت اب بیٹھے بیٹھے کم ہو چکی تھی اور سنہری شام کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ہر جگہ اطمینان تھا۔ ایک مدت بعد بچھڑے ہوئے سب کو ملنے کی خوشی تھی۔ غلام مصطفیٰ نے اپنی اولاد کی خوشی کی خاطر۔

اور رئیس عارف نے مسکرا کر سوچا۔ "میں نے بچپن میں جو کچھ کیا تھا آج اس کا ازالہ کر دیا۔ اس کی جھولی میں ڈال کر زندگی اتنی ہی غلطیوں کوتاہیوں اور خوشیوں سے عبارت ہے۔ ہر وقت جب ازالہ کرنے کی دعوت دے تو خوش دلی سے وہ دعوت قبول کر لینی چاہیے۔"

قدرت کی مہربانی سے زندگی نے اپنے خوبصورت ساری خوشیاں ان پر نچھاور کر دی تھیں۔

سیف کی ہنسی عنیزہ کے قہقہوں کو واپس لے آئی۔ سورج نے سرشاری سے دیکھا اور مغرب کی طرف کروٹ بدل کر آنکھوں سے اوجھل ہوا۔

اور سنہری شام اتر آئی ان کے آنگن میں اتر آئی۔

*

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ
ایڈوینس
آپ دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۲۴ اردو بازار کراچی